اگر رسول اللہ صلعم نے حدیث کسی خاص موقع کے لحاظ سے ارشاد فرمائی ہے تو اس کی بھی وضاحت کردی ہے تاکہ اس پس منظر میں اس کا مفہوم اچھی طرح واضح ہوجائے، جن حدیثوں سے مشرکین، یہود و نصاریٰ یا خود مسلمانوں کے فرقوں اور گروہوں کے غلط عقائد و اعمال کی تردید ہوتی ہے ان پر اسی حیثیت سے بحث و گفتگو کی ہے، مثلاً آنحضرت صلعم کی عدم بشریت یا امور غیبیہ سے واقفیت وغیرہ کے جو لوگ قائل ہیں ان کی مدلل تردید کی ہے، حدیث نبوی صلعم کی اس مفید خدمت پر مصنف مبارکباد کے مستحق ہیں البتہ تشریح میں تکرار اور غیر ضروری طوالت سے کام لیا گیا ہے، لغت، نحو اور اشتقاق کی بحثیں اردو داں طبقہ کیلئے زیادہ مفید نہیں، مصنف نے محدثین اور علمائے فن کے اقوال بلا حوالہ درج کیے ہیں، جن کتابوں سے حدیثیں نقل کی ہیں ان کے حوالے تو دیے ہیں مگر ابواب، جلدوں اور صفحات وغیرہ کی صراحت نہیں کی ہے، تحریر میں بھی ناہمواری اور کہیں کہیں ژولیدہ بیانی ہے، عربی کے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو اردو میں نامانوس اور غیر مستعمل ہیں، جیسے حقیقی، خطورت اور استماع وغیرہ، اسی طرح جمع جیسے اجور، جوانب، زوایا، سرائر و دیار حد یہ ہے کہ عربی قاعدہ کے مطابق تثنیہ کا بھی استعمال کیا ہے، لکھتے ہیں من اور ما دونوں کلمیں عموم کیلئے آتے ہیں، بہت سے لفظوں کی جمع جا بجا ہے غلط نہ ہو مگر ثقیل ضرور ہے، مثلاً خونوں، جانوں، مالوں، طلوع کے معنی طلوع کرنا لکھا ہے، یہ غلط ہے، صحیح معنی طلوع ہونا ہے۔

موج صبا: مرتبہ جناب اختر مسلمی صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۱۶ مجلد مع گرد پوش، قیمت بارہ ۱۲ روپے، غیر مجلد دس ۱۰ روپے، پتہ: اختر مسلمی صاحب سرائے میر، اعظم گڈھ، (یوپی)

جناب اختر مسلمی ضلع اعظم گڈھ کے مشہور شاعر ہیں، ان کا پہلا مجموعۂ کلام بیس ۲۰ برس قبل موج نسیم کے نام سے شائع ہوا تھا جو اب نایاب تھا، اس لیے زیر نظر مجموعہ میں اس کلام کے ساتھ اس کا انتخاب بھی دیا ہے، انکو تغزل سے خاص مناسبت ہے اور وہ حسن و عشق کے لطیف جذبات اور الفت و محبت کی واردات و کیفیات کی ترجمانی دلآویز پیرایہ میں کرتے ہیں، بوڑھوں کو چمن ناز کی خاک چھاننے کے بعد وہ حقیقت کی راہ پر گامزن ہوئے ہیں اس لیے ان کے کلام میں درد و تشنگی کی کیفیت پیدا ہوگئی ہے اور اسی لیے انھوں نے اس مجموعہ کی ابتدا حمد و مناجات سے کی ہے، اختر صاحب کے حساس و دردمند دل نے ملک و قوم کے موجودہ حالات، مسائل اور عام معاشرتی، قومی اور سیاسی زندگی کے نشیب و فراز کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اسی لیے ان ابیات کی خودغرضی، ملت و قوم کے مسائل سے ان کی غفلت، فرقہ واریت، تنگ نظری، مسلم رہنماؤں کی مداہنت اور مصلحت پسندی اور قومی، سیاسی، اخلاقی اور مذہبی زندگی کی عام ناہمواریوں اور خرابیوں کو بھی انھوں نے اپنے تغزل کا موضوع بنایا ہے اور اخلاق و شرافت اور حق پسندی و حق گوئی کا درس بھی دیا ہے مگر اس سے تغزل کی دلکشی و لطافت میں کوئی فرق نہیں آیا ہے، یہ مجموعہ تغزل کا اچھا اور پاکیزہ ذوق رکھنے والوں کے لیے ضرور سامان کیف و لطف ہوگا۔ "ض"

جلد ۱۳۰ ماہ محرم الحرام ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۸۲ء عدد ۵

مضامین

معارف کا سالانہ چندہ ملک و بیرون ممالک کیلئے

۱۔ ہندوستان	20.00	روپیے
۲۔ پاکستان	40.00	"
۳۔ سعودی عرب	62	"
۴۔ دیگر ممالک	86	"

"منیجر"

شذرات

اتر پردیش کی قانون ساز اسمبلی میں اردو اس ریاست کی سرکاری زبان تسلیم کرنے کو تو کر لی گئی ہے، لیکن اب تک اس کے سرکاری ہونے کا ثبوت نہیں مل رہا ہے۔

اس مسئلہ پر کچھ لکھنا سینہ کے داغ سے دل کے پھپھولے جلانا ہے، یا پرانے زخم کے پھاہے کو بدل کر مطمئن ہو جانا ہے، بہار میں اردو کچھ اضلاع میں سرکاری زبان تسلیم کر لی گئی تو وہاں کی حکومت کی رواداری اور فراخ دلی کی بڑی شہرت ہوئی، مگر وہاں عام خیال یہ ہے کہ کاغذ پر اردو کی سرکاری حیثیت ضرور تسلیم کر لی گئی ہے، لیکن اس سے زیادہ اب تک کچھ اور حاصل نہیں ہو سکا ہے، کہیں یہ صورت حال اتر پردیش میں بھی نہ ہو، ستم ظریفی یہ ہے کہ اردو بولنے والوں کے چنگل میں کچھ آنے سے پہلے حکومت کے اس فیصلہ کی مخالفت جلسے اور جلوس کے ذریعہ ہو رہی ہے، جیسے اردو بولنے والوں کو وہ سب کچھ مل گیا ہے جس سے ہندی پس پشت ڈال دی جائے گی۔

اردو اور ہندی کا جھگڑا دلائل و براہین یا افہام و تفہیم سے طے کرنے کی منزل میں نہیں، ملک کے مشہور رہنما ہیم وتی نندن بہوگنا نے دہلی کے ایک جلسہ میں کہا تھا کہ یہ اردو اور ہندی کا جھگڑا نہیں ہے بلکہ اردو اور ناسمجھی کا جھگڑا ہے، جس روز یہ ناسمجھی ختم ہو جائے گی، یہ جھگڑا بھی ختم ہو جائے گا، یہ ناسمجھی ملک کو کہاں لے جا رہی ہے، اس پر ضرور غور کرنا ہے، رہی اردو تو اردو بولنے والوں کو زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اگر اردو میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہے تو کوئی اس کو مار نہیں سکتا، اور اگر اس میں مر جانے کی صلاحیت ہے تو اس کو کوئی زندہ نہیں رکھ سکتا ہے، ہاں اگر سمجھ داری سے کام لیا جائے تو دونوں ہمسایہ زبانوں کی خوبیاں ایک دوسرے کو متاثر کر کے دونوں کو جاندار اور باوقار بنا سکتی ہیں۔

لیکن ایسے دلائل اب فرسودہ ہو چکے ہیں، کچھ کہنے اور سننے کا موقع نہیں رہا، مگر یہ سوچنا ہے کہ طرز فکر میں جارحانہ رنگ بڑھتا گیا تو ملک کا کیا مستقبل ہوگا، جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کے نعرے تو برابر یہاں کی فضا میں گونج رہے ہیں لیکن اس حقیقت پر کون پردہ ڈال سکتا ہے کہ جنوبی ہند کو شمالی ہند پر بھروسہ نہیں رہا، میزورام اور ناگالینڈ سے تشویشناک خبریں آتی رہتی ہیں، ہریجنوں کی طرف سے دلستان کی تحریک کی آواز بھی اٹھنے لگی ہے، کشمیر کی قانون ساز اسمبلی میں جو قرار دادیں منظور ہو رہی ہیں وہ کم توجہ طلب نہیں، ملک میں جو ہندو مسلم فسادات ہوتے رہتے ہیں اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ملک بیرونی حملوں کو مسلح ہو کر کچل دینے کے لیے تو بالکل تیار ہے لیکن ان فسادات کو روکنے سے قاصر ہے، سکھوں کو معلوم نہیں اپنے متعلق کیا خوش فہمیاں اور حکومت سے کیا غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں کہ وہ خالصتان کے لیے خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے ہیں۔

ایسی بے اطمینانی، شر انگیزی اور شورہ پشتی تو کم و بیش ہر ملک میں دیکھنے میں آتی ہے مگر اس پر بھی نظر رکھنا ضروری ہے کہ جذباتی ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کی خوشگواری پیدا ہونے کے بجائے کہیں یہ خیال عام نہ ہو جائے کہ یہ ملک سب کا نہیں ہے بلکہ ایک مخصوص طبقہ کا ہے، جس کے جذبات، احساسات اور خیالات کے ماتحت ہو کر سب کو رہنے کا نام قومی یکجہتی ہے، ملک کی سالمیت کی خاطر طبقاتی، علاقائی، لسانی اور مذہبی علیحدگی پسندی کو کسی لحاظ سے مناسب نہیں، ایسے انتشار کو کچل کر رکھ دینا حکومت کا حق ہے، مگر یہاں کے ہر طبقہ کو مطمئن اور خوش رکھنا بھی حکومت کا فرض ہے، پہلے راجا اور بادشاہ بھی ایسی بغاوتوں کو کچل کر رکھ دیا کرتے تھے، اس لیے ان سے ایسی نفرت ہوتی گئی کہ اس کی جگہ اب جمہوریت آگئی ہے، جمہوریت کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ جھک کر اپنے قد کو بالا کرے، مفتوح ہو کر فاتح بنے، دلوں کو دے کر دلوں کو حاصل کرے، نہ کہ بادشاہت ہی کی تاریخ کو دہرائے۔

بادشاہت اور دنیا کی موجودہ جمہوریت میں اب تک بہت سی چیزیں مشترک ہیں، وہی جوع الارض کی چنگیزی، وہی جاہ طلبی کی پرویزی، وہی اقتدار پسندی کی طالع آزمائی، وہی جنگ و جدل کی خون آشامی، اور خود ہر ملک کے اندر شہریوں کے خون کی وہی ارزانی دکھائی دیتی ہے جو بادشاہت کے زمانہ میں تھی، بادشاہ اپنی بادشاہت کو برقرار

رکھنے کے لیے اس کو ظلِ الٰہی اور نیابتِ الٰہی قرار دیتے تھے، جمہوریت کے پاسبان اپنی حکومت کو سنبھالنے کیلئے اس کو عوام کی مقدس امانت اور انسانی فلاح و بہبود کی واحد ضمانت بتاتے ہیں، مگر بادشاہ جس طرح عوام کا استحصال کیا کرتے تھے اسی طرح جمہوریت کے امین عوام کے جذبات سے کھیل کر اپنے اقتدار کا پرچم لہراتے رہتے ہیں۔

مگر دنیا کی اس جمہوریت میں کچھ ایسی چیزیں بھی آگئی ہیں جو بادشاہت کے زمانہ میں نہ تھیں، مثلاً اس جمہوری دور میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں رہی کہ کہو کچھ اور کرو کچھ، بند کمرے میں کچھ اور باتیں کرو، باہر نکلو تو کچھ اور بیان دو، اعلان کچھ اور کرو مگر ضرورت ہو تو اس کی تردید بھی کر دو، عوام کے نام کی مالا جپو مگر عوام کی ضروریات کو پورا کرنا ضروری نہ سمجھو، غریبی کو مٹانے کا نعرہ بلند کرتے رہو، مگر سرمایہ داروں کی اعانت برابر کرتے رہو، سیکولرزم کا پرچم لہراتے رہو، مگر گروہ بندی جو خود چاہو، قومی بہاؤ کا درس دو، لیکن اپنی بات منوانے کے لیے جارحانہ رنگ اختیار کرو، چاہے یہ قومی بہاؤ کے منافی کیوں نہ ہو، عوامی حقوق کی بحالی کے لیے جمہوری طرز کا انتخاب لڑو، اور جب انتخاب جیت جاؤ تو جمہوری اور اخلاقی قدروں کی پامالی کرتے رہو، ضرورت ہو تو جھوٹ، ضمیر فروشی اور بے مروتی سے کام لو اور کہدو کہ محبت، جنگ اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے۔

اب یہ مستقبل ہی بتائے گا کہ ایسی جمہوریت گلاب کے پھول کی طرح شاداب اور دلآویز نظر آئے گی یا مرجھائے اور سوکھے ہوئے پھولوں کی طرح وطن کے چمن کی زینت میں کمی پیدا کرتی رہے گی، پھر شاعر مشرق اقبال نے جو یہ کہا ہے کہ

جمہور است تیغِ بے نیامے

اور یہ کہ

نماند در غلافِ خود زمانے　　　برد جانِ خود و جانِ جہانے

تو کہیں یہ صحیح ثابت نہ ہو۔

مقالات

مستشرقین کے تصوّرِ اسلام کا تاریخی پس منظر

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی۔ دہلی یونیورسٹی

مشرق اور مغرب کا سابقہ، تاریخ کا نہایت اہم بالشان واقعہ ہے، اس آویزش و پیکار کا اصلی سبب کیا تھا؟ ہیروڈوٹس سے لیکر اس وقت تک، تمام محققین اور مورخین نے اسکا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن ابھی تک اس کا کوئی شافی جواب نہیں مل سکا ہے اصل میں اس کا جواب ہو بھی نہیں سکتا، مشرق و مغرب کی پیکار صرف ایک جغرافیائی سادہ بیانی ہے، ورنہ اس کی سطح کے نیچے بہت سے پُرپیچ اسباب چھپے ہوئے ہیں، جو نژادی اور نسلی بھی ہیں، علاقائی بھی۔ سیاسی بھی، مذہبی بھی، نفسیاتی بھی، اقتصادی بھی اور نظریاتی بھی‘ ...... اسی لئے ان اختلافات نے ہر عہد اور ہر زمانہ میں ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے‘ ان ہی معرکوں میں وہ زبردست کشمکش نظر آتی ہے، جو صدیوں سے اقوام مغرب کی تہذیب و کلیسا، اور اسلام کے درمیان رہی ہے، اور جس کی ابتدا، ہیرکلس کی شکست سے ہوتی ہے جو

اس کو مسلمانوں سے یرموک کے مقام پر ۶۳۶ء میں اٹھانا پڑی، یہ آویزش کب ختم ہوگی اس کا جواب بھی آسان نہیں ہے۔

اسلام جس برق رفتاری سے پھیلا ہے، اس کی مثال بھی تاریخ عالم میں نہیں مل سکتی ہے، بہت جلد اس نے شام و مصر سے لیکر فرانس کے پایرنیز تک تمام ملکوں پر قبضہ کر لیا تھا، بحر نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر ۷۱۱ء میں مسلمان اسپین اور ۷۱۲ء میں ہندوستان تک پہنچ گئے تھے، اسپین میں قدم جمانے کے بعد انھوں نے پرووانس، اٹلی اور سوئٹزرلینڈ پر حملے کئے اور اطالیہ اور فرانس پر اپنا تہذیبی اثر قائم کیا۔

قرطبہ کے فلسفہ اور ابن رشد کے افکار تازہ پر پیرس یونیورسٹی میں بحثیں ہوتی تھیں، عربوں کا فن تعمیر، عربوں کی سائنس، عربوں کا علم ہندسہ و جغرافیہ اور عربوں کی شاعری نے فکر و خیال اور زبان و بیان کو اتنا متاثر کیا کہ ان سے یورپ میں نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوا۔

۱۱۰۰ء سے لیکر ۱۳۰۰ء تک صلیبی جنگیں بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں، جن کی بدولت مشرق و مغرب میں شدید تصادم بھی ہوا اور پھر امتزاج بھی، مغرب نے مشرق کے اثرات قبول کئے اور اس کے علمی خزانہ سے استفادہ کیا، اور ان تمام اسباب و عوامل نے مل کر جدید یورپ کی تشکیل کی، جو نشاۃ الثانیہ دور اصلاح اور ایجاد و دریافت سے عبارت ہے،

بحیرۂ روم کے مشرق میں بھی کم و بیش یہی صورت تھی، ۱۳۵۰ء سے ۱۵۵۰ء تک اسلام اور عیسائیت میں مسلسل آویزش رہی، مسلمان اپنے ولولہ انگیز مذہب، اپنی فصیح و بلیغ مذہبی زبان اور اپنی ہمہ گیر تہذیب کی بدولت تمام ایشیا اور افریقہ و یورپ پر چھا گئے تھے عثمانی ترک قسطنطنیہ ۱۴۵۳ء پراگ، اور وائینا ۱۵۲۹ء تک پہنچ گئے تھے، ۱۵۲۶ء میں ہنگری انکی مملکت میں شامل ہوگیا تھا، اور اسی سنہ میں ہندوستان میں بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی

اور ان کی حکومت بڈاپسٹ سے لیکر بنگال تک قائم ہوگئی، اور تجارت کے بیشتر بحری اور بری راستے ان کے قبضہ میں آگئے، مصر یورپ اور ایشیا کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا، پانچویں صلیبی جنگ اسی کو لینے کے لیے لڑی گئی تھی، لیکن اس میں عیسائیوں کو ناکامی ہوئی بحیرۂ ہند بھی جو اب تک عربوں کی جھیل سی معلوم ہوتی تھی ان کا اقتدار تھا، ۱۴۹۸ء میں پرتگالیوں نے ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کر کے عربوں کے اس بحری اقتدار اور تجارت کو سخت نقصان پہنچایا اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصر کی اقتصادی حالت تباہ ہوگئی۔ ترکوں اور مصریوں نے مل کر بحیرۂ ہند میں پرتگالیوں کی بحری قوت کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی (۱۵۳۸ء) ترک بار بار کہتے تھے کہ "اللہ نے زمین تو ہمیں دے دی ہے، لیکن سمندر عیسائیوں کو بخش دیا ہے" اس وقت ترک سلاطین ہندوستان کے مغل بادشاہ اور قلمرو ایران کے صفوی حکمران یہ تینوں بری طاقتیں اس لائق نہیں تھیں کہ یورپ کی بحری قوت کا بحیرۂ ہند یا بحر اوقیانوس میں مقابلہ کر سکتیں، یورپ کو ایک نیا راستہ ہی نہیں، امریکہ کا ایک نیا بر اعظم بھی مل گیا تھا۔

پرتگال کو مسلمانوں سے جو عداوت رہی اس کو اس زمانہ کے تاریخی حالات کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے، صلیبی جنگوں سے جو کدورت اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ جزیرہ نمائے ۱۴۰۰ تا ۱۵۰۰ء میں، پندرھویں اور سولھویں صدی کے اندر، تیز تر ہوگیا، اس کی ایک تو وجہ یہ تھی کہ مسلمان اسپین میں طاقتور حکمران کی حیثیت سے موجود تھے، اور پرتگال کو ان سے ہر وقت ڈر رہتا تھا کہ وہ بھی ضم نہ ہو جائیں، ان سے جنگ، مذہبی ضرورت بھی تھی، اور ملکی مصلحتیں بھی اس لڑائی کی متقاضی تھیں۔

یورپ کے بحری اقتدار سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، رفتہ رفتہ انکی حاکمیت، ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصوں میں قائم ہوگئی، اور سیاسی اور اقتصادی استحصال

کے لیے ان کو بڑے بڑے ملک مل گئے، اطالوی اور فرانسیسی، شمالی افریقہ میں حکمراں تھے جرمن ترکی میں بڑھ رہے تھے، روسی وسط ایشیا کو زیر و زبر کر رہے تھے، اور ہندوستان، مصر اور عراق میں تا حدِ نظر، برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا، اسی نقطہ سے مسلمانوں کا زوال اور یورپ کا عروج شروع ہوتا ہے۔

یورپ کی یہ توسیع سر تا سر مسلمانوں کے خلاف تھی، ان کی کمزوری ہی پر جو ۱۶۰۰ء سے ۱۹۰۰ء تک اپنی آخری حدوں کو پہنچ گئی تھی، یورپ کی ترقی کا محل تیار ہوا تھا، اس بات کے اعادے میں بھی مضائقہ نہیں کہ یورپ کی ترقی سے پہلے مسلمانوں کی سلطنت ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی، اور اسی لیے یورپ کی توسیع پسندی اور سامراجیت کا خاص ہدف ایشیا اور افریقہ کے مسلمان ممالک تھے۔

اقوامِ یورپ نے اپنی حاکمانہ اور اقتصادی گرفت کو کئی طریقوں سے مضبوط کیا جسکی تفصیل آگے آئے گی، اس وقت یہ اشارہ کافی ہے کہ مشرق میں قدیم و جدید، سائنس اور مذہب اور اسلام اور عیسائیت کی آویزش خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی، اور اس نے پوری پوری آبادیوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا تھا، اس وقت ایشیا کا سیاسی، مادی اور اخلاقی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا، یہاں اگر کچھ رہ گیا تھا تو صرف اوہام کا تار و پود۔ قوائے عمل شل ہو گئے تھے اور شعلۂ حیات سرد ہو رہا تھا۔ اور منفی طرزِ فکر نے اُن کو بے عمل بے ذوق، کاہل اور ناکارہ بنا دیا تھا۔ یورپ کا یہ حملہ صرف بحر و بر ہی پر نہیں تھا، یہ حملہ ان کے عقائد، ان کے فلسفہ، ان کی روایات، ان کی تاریخ، ان کی بلند ترین شخصیتوں پر بھی تھا، ۱۸۵۷ء کے بعد تو بقول ٹوئن بی "مغرب کا تیر مشرق کی روح میں پوری طرح پیوست ہو گیا تھا" اور وہ مرغِ بسمل کی طرح تڑپ رہے تھے" چند غیر معمولی اشخاص کو چھوڑ کر، سب ہی پر یاس و الم کے بادل چھا گئے تھے، شاعر جنازہ بر دوش، عالم تقلید پرست

اور ذوق و جستجو سے عاری، صوفی، فنا کے راستہ میں مستغرق، استاذ تکوینی جوہر سے ناآشنا اور نئے تقاضوں سے یکسر بے خبر۔

مشرق کے خلاف، یورپ کی جارحیت ہمہ جہت تھی، ان کے حملے صرف فوجوں کے ذریعہ نہیں ہوئے، اس میں ان کے دانشور مستشرقین، اہلِ فکر، شعرا، علما اور اساتذہ بھی شامل تھے، اسی لیے اقبال نے مغربی مدرسوں کی کور نگاہی، اور بے ذوقی کی شکایت کی ہے،

ع نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مغربی اثرات کے چیلنج کا، ردِ عمل، مشرق پر ایک دائرہ کی شکل میں رونما ہوا جسمیں رد و قبول، تقلید و ایجاد تنقیدی فکر اور بہترین اقدار کا انتخاب اور اعتماد کے ساتھ، اپنی صالح مشرقیت پر جمے رہنے کا انداز کارفرما ہے، لیکن مغرب نے نئے نئے دام بچھائے تھے اور ایک ایسی نسل کو تیار کیا تھا، جو اپنی ذہنیت اور مرعوبیت میں بالکل مغرب زدہ اور مشرق سے بیزار تھی، دراصل اہلِ کلیسا کا یہ نظامِ تعلیم اقبال کے الفاظ میں:-

ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف

اقبال نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صراحت سے لکھا ہے، کہ لندن میں مشرقی و افریقی علوم کا ادارہ صرف برطانوی سامراجیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے قائم کیا گیا ہے، اسی قسم کے خیالات انھوں نے حافظ فضل الرحمٰن انصاری کے نام ایک خط میں ظاہر کئے ہیں لکھتے ہیں:-

"جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے۔ فرانس، جرمنی انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاقِ حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے، سادہ لوح مسلمان طالب علم اس

طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔

اقبال کو افسوس تھا کہ مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان، روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں۔ ان کی نظر مساوات شکم سے آگے نہیں جاتی، وہ روح کو معدہ میں تلاش کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ روح کی قوت و حیات کا جسم سے کوئی تعلق نہیں، یہ اور اس قسم کے بہت سے خیالات اُن مغربی دانش وروں کے ذریعہ پھیلے، جن کے آگے زانوئے تلمذ تہ کئے بغیر ترقی ممکن نہیں تھی۔

جب اقوام مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا چاہی کی تو اس کی ضرورت بھی محسوس کی کہ اُن کی زبانوں کو، ان کے مذاہب کو اور ان کی تہذیب و تمدن کو سمجھیں، اور اُن کو اپنے رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃً اعلیٰ و ارفع نظر آئے اور ان کی صنعت و حرفت اور سامان تجارت بہتر ٹھہرے۔

جن عالموں نے اس اقلیم میں قدم رکھا، وہ مستشرق کہلائے اور پورا ایک نیا علم اورینٹلزم کے نام سے وجود میں آگیا، یہ مشرق اورینٹ (ایسٹ نہیں) اصل میں مغرب کا زائیدہ فکر ہے، جہاں تخیل ہی تخیل ہے رومانس ہی رومانس ہے، اس میں شدید جنسیت ہے عیش و عشرت کی بہتات ہے، بھوک اور بے رحمی ہے، اس کی میزان قدر میں قرآن پاک اہم نہیں ہے، الف لیلہ اہم ہے جو عربی ادبیات میں معمولی درجہ کی کتاب ہے، یہ مشرق مغرب کی مادی تہذیب کا حصہ بن گیا ہے، اس میں عجیب و غریب آدمی رہتے ہیں، نیم وحشی، نیم متمدن، نیم برہنہ، خواجہ سگ پرست بھی، نعمان سیاح بھی، زاہد بھی، رند بھی، اس مشرق کی دولت بے کراں ہے، اس کی خام پیداوار کے بغیر مغرب کے کارخانے نہیں چل سکتے، یہ مشرق تہذیب کا گہوارہ اور مذاہب کا سرچشمہ ہے، یہ مشرق، مغرب کے مادی مفادات کا مرکز و محور ہے اس مشرق کو

یورپ نے سماجیاتی، فوجی، جنگی اور سیاسی طور پر پیدا کیا ہے اور اس پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان سے ایک اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے۔

اس مشرق کا جو کلیۃً مغربی تصورات اور مفادات کی پیداوار ہے، کچھ تھوڑا سا اندازہ دانتے کی مشہور و معروف نظم طربیہ خداوندی سے ہو سکتا ہے، ۱۳۱۲ء اور ۱۳۲۱ء کے درمیان تصنیف ہوئی، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اہل یورپ، مشرق کے بالخصوص اسلام کے متعلق کیسے گھناؤنے تصورات رکھتے تھے اور اُن کا بس نہیں چلتا تھا کہ عشق محمدؐ ان کے دل سے نکال دیں، اسلئے کہ اسی آئیڈیل پر ان کی عظمت قائم تھی۔

اس نظم نے یورپ کے ذہن و ضمیر پر بے انتہا اثر ڈالا ہے اور اتنے ماہ و سال گزرنے کے بعد تو اس میں تاریخ کی سی تقدیس اور سچائی پیدا ہو گئی ہے، طربیہ خداوندی کے تین حصے ہیں، دوزخ، برزخ اور فردوس، دانتے، مشرق و مغرب کی اہم شخصیتوں سے واقف تھا، مثلاً وہ ورجل، ہومر، ابن سینا اور ابن رشد سے واقف ہے، اور مسلمانوں اور یہودیوں کی تاریخ سے بھی ناآشنا نہیں تھا، اُس میں عیسائیوں کی کور نگاہی، تنگ دلی، اور عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اس کا یہ ایمان ہے کہ مغفرت کے سزاوار صرف کیتھولک عیسائی ہیں باقی سب دوزخ کا کندہ ہیں دانتے نے دوزخ Inferno کے Canto 28 اور نویں طبقہ جہنم یعنی اقلیم عذاب میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ بڑی ہی ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے، نقل کفر کفر نباشد، یہ دکھلایا ہے کہ شکم مبارک چاک ہے اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ انتڑیاں باہر لٹکی ہوئی ہیں اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جن کو خود نعوذ باللہ دو حصوں میں چیر دیا گیا ہے۔

فرماتے ہیں دیکھو میری حالت، یہ سیاہ ترین بدمستیوں اور بدکاریوں کا نتیجہ ہے، یہ عیسائیت کو
مسخ کرنے، فریب اور ریاکاری اور نفاق کو پھیلانے اور اختلاف کا بیج بونے کی سزا ہے۔
استغفراللہ ——— دانتے کو پاپائیت اور کیتھولک فلسفہ اور عقیدے پر پورا
یقین تھا، اور اس کے تخیل کے سارے نقش و نگار، اسی مذہبی تعصب کے پیدا کردہ ہیں،
طربیہ خداوندی کی تعمیر و ترکیب میں بھی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایتوں،
تمثیلوں اور یونانی، رومی اور عرب صنمیات کے علاوہ سب سے زیادہ دخل اس تعصب کو ہے،
جو صلیبی جنگوں سے عیسائیوں کے دلوں میں، جاگزیں تھا اور اس میں سب سے بڑی کرشمہ
سازی اس زہریلے تخیل کی ہے، جو دانتے کی شاعرانہ تخیلات کا حصہ بن گیا تھا، اس کا
اتنا گہرا اثر مغرب پر ہوا ہے کہ انھوں نے طربیہ خداوندی کو صحائفِ آسمانی میں شمار کر لیا تھا۔

میرا یہ عرض کرنے کا یہ مقصد ہے کہ دانتے سے لے کر انیسویں صدی کے ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور
اور بیسویں صدی کے مانٹ گمری واٹ تک اسلام کا کم و بیش یہی تصور ان کے سامنے
رہا ہے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہندوستان میں، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز
افسر آئے وہ بھی یہی تخیل رکھتے تھے، اور وہ عیسائیت کی سب سے بڑی خدمت یہ سمجھتے تھے کہ
ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنالیں۔ ان کی عظمتِ دیرینہ کو ختم کر دیں اور ان کے
دل سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نکال دیں، وہ خوب جانتے تھے کہ
اس محبت کے بغیر اسلام کی عمارت ڈھہ جائے گی، ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۷ء کے درمیان،
مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان، جو مناظرے، پہلے آگرے، اور پھر دہلی میں ہوئے،
ان میں بھی یہی تخیل اور یہی تعصب کار فرما ہے۔

۱۸۰۳ء میں عیسائیوں نے دہلی میں قدم جمائے اور ۱۸۰۳ء ہی میں حضرت

شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے یہ فتویٰ دیا کہ ہنگلی سے لے کر دلی تک سارا علاقہ، انگریزوں کے
زیر اثر آگیا ہے اس لیے ان کے خلاف لڑنا ہمارا دینی فرض ہے لیکن اسی کے ساتھ ہمیں ان کے
نئے علوم کو بھی سیکھنا چاہیے، ۱۸۴۴ء اور ۱۸۵۴ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر
وزیر خان اور Rev. Pfander کے درمیان آگرے میں جو مذہبی بحثیں اور مناظرے
ہوئے ان سے بھی عیسائیوں کی یہی کورفہمی، تنگ نظری اور عصبیت جھلکتی ہے جو صلیبی جنگوں
اور دانتے کی بدولت ان کو وراثۃً ملی تھی، سرسید کا یہ خیال صحیح ہے کہ اسی کی وجہ سے
۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علماء نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالی تھی۔

۱۸۳۳ء میں جو چارٹر ایکٹ آیا اس نے بھی مسیحی مبلغین کو بالکل بے لگام کر دیا تھا،
اور انھوں نے مسلمانوں کی دل شکنی اور دل آزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی، اس کی
شہادت ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید کی تحریروں سے بخوبی مل جاتی ہے۔

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں مشرق کے زوال اور مغربی استحصال کے ساتھ ساتھ،
اسلام اور اسلامی ممالک کی غلط تعبیر کے لیے ایک نیا ڈسپلن وجود میں آیا جس کو اورینٹلزم کہا جاتا
ہے، میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اس شر میں خیر بھی شامل تھا، اس سے
بالواسطہ تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلیں اور سماجی اور سائنسی علوم کی مدد سے ریسرچ پہلے
کے مقابلے میں زیادہ خزینہ دار اور تونگر بن گئی لیکن انیسویں صدی کے اواخر تک یہ کوشش
جھوٹی سچی روایتوں اور افواہوں افسانہ طرازیوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مجموعہ تھی،
جس کے پیچھے سامراجی مقاصد تھے، ان مقاصد پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے اور
عام طالب علم، ان پردوں کے نقش و نگار ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے، ڈاکٹر اسپرنگر کی کتابیں
بزبان انگریزی Life of Mohammad from original-

-Sources by Dr. Sprenger, Allhd. 1851

اور Life and Doctrines of Mahammad.

from Sources hither to un-used in-

3 vols. by A. Sprenger.

اور بزبان جرمن جو برلن سے ۱۸۶۵ء میں شایع ہوئیں، اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں،

اسپر نگر کا ماخذ واقدی ہے، جس کے متعلق تمام دنیا یہ جانتی ہے کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا، اور اس کی غلط روایتوں، افسانہ طرازیوں اور جھوٹے قصے کہانیوں، اور بے سند باتوں کی وجہ سے اسے تمام علماے اسلام نے جھوٹا اور نامعتبر قرار دیا ہے۔

یہی حال سر ولیم میور کا ہے جن کے اعتراضات سے سر سید کا کلیجہ چھلنی ہوگیا تھا اور اسی کا جواب لکھنے کے لیے وہ انگلستان گئے۔ اور اس کا جواب انھوں نے خطباتِ احمدیہ لکھ کر دیا جسکو انھوں نے ۱۸۷۰ء میں اپنے برتن بیچ بیچ کر لندن سے شایع کیا، یہاں یہ جملہ معترضہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ اس وقت ہندوستان دولت سے خالی ہوگیا تھا، اور یہ اسی کے خزانے تھے، جن کی بدولت انگلستان میں صنعت کو فروغ حاصل ہوا، ملک و مال کے جانے کے بعد ہندوستان کا علمی خزانہ بھی خالی ہوگیا تھا، ۱۷۹۹ء، ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء کے بعد یعنی میسور، اودھ اور دہلی کے سقوط کے بعد ہماری کتابیں بھی انگلستان چلی گئی تھیں، اسی لیے سر سید کو ضروری کتابیں دیکھنے کے لیے انگلستان جانا پڑا۔

غنی روزِ سیاہ پیرِ کنعاں را تماشا کن که نورِ دیده‌اش روشن کند چشمِ زلیخا را

سر سید سر ولیم میور کی لائف آف محمد کا جواب لکھنا چاہتے تھے، میور نے یہ کتاب پادری فنڈر کے حکم پر اور اس کے مشن کو تقویت پہنچانے کے لیے لکھی تھی یہی وجہ ہے کہ سر ولیم میور نے

حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بڑی بڑی گستاخیاں کی ہیں اور نعوذ باللہ ان کو بازی گر، فتنہ پرداز، عیش پسند، فریبی اور ریاکار کہا ہے، غرض وہ تمام رکیک اور بے ہودہ الفاظ استعمال کئے ہیں، جو اس سے قبل صلیبی جنگوں اور دانتے کے ذریعہ رائج ہو چلے تھے۔

کارلائل اور گبن کے یہاں چند اچھے کلمات بھی مل جاتے ہیں، لیکن ان کی استثنائی حیثیت ہے، اور نہ وہ صحیح معنوں میں مستشرق ہیں انیسویں اور بیسویں .... صدی کے اوائل تک حضور رسالت مآبؐ کو اور اسلام کو مسیحی تعصب سے جانچا گیا، اور اسلامی تاریخ کو مسخ کر کے اسکولوں اور کالجوں میں پیش کیا گیا، عیسائیوں نے مسلمانوں کی عظمتِ دیرینہ اور تہذیبی برتری پر کاری ضرب لگائی، اس لیے کہ بقول اسپر نگر جو قدیم دہلی کالج کا پرنسپل تھا، اسی عظمت کے احساس نے ان کو لکھنؤ اور دہلی کی مدافعت میں جو ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں عمل میں آئی، ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ موت سے آنکھ ملا سکیں اور بے پناہ اور ناقابلِ تسخیر بن جائیں۔

بیسویں صدی میں سائنس اور ہائی ٹکنالوجی نے بے حد ترقی کی ہے، آج زمین کی طنابیں کھچ گئی ہیں، اور ہم اسی وقت یہاں بیٹھے بیٹھے دنیا کی خبریں دیکھ اور سن سکتے ہیں، اس صدی کو صحافت، اور ٹیلی کمیونی کیشن کی صدی بھی کہا جاتا ہے، لیکن انگلستان اور امریکہ کے بیشتر اخبارات Stateman ،News لندن سے لے کر نیویارک کے Times تک یہودیوں کے قبضہ میں ہیں اور انھوں نے اس آویزش و پیکار میں جو صلیبی جنگوں سے شروع ہوئی تھی ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے، اس معاملہ میں ہماری بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بھی انگریزی اخبار نہیں، حالانکہ ان کی آبادی ۲۰ ملین کے قریب بتائی جاتی ہے!

بیسویں صدی میں عیسائیوں کے ضمیر نے ایک نئی کروٹ لی ہے، یا یہ پرانے

شکاری ایک نیا جال لائے ہیں، یا تیں کی اہمیت کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی ادا سے کچھ نرم کرنا چاہتے ہیں، بہرحال اسی وجہ سے علم کی خاطر کم اور سیاست کی وجہ سے زیادہ
Wood Brooke College
نے
Christian Muslim Dialogue
شروع کیا ہے، اس سے اُمید بندھتی ہے کہ تعصب کے پردے چاک ہوں گے، اور گرچہ ہے کس کس خرابی سے دلے بایں ہمہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی علمی کوشش سے ایک صحیح تصویر اُبھرے گی۔

یہاں عالم اسلامی کے سب سے بڑے سیرت نگار اور دیدہ ور مورخ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ضروری ہے، جن کی ساری زندگی جہاد علمی میں گزری اور انھوں نے مستشرقین کا جواب اپنی گراں قدر تصانیف کے ذریعہ دیا۔

مقالات شبلی تاریخی

جلد ششم

سلسلۂ مقالات شبلی آٹھ جلدوں پر مشتمل ہے، یہ جلد مولانا کے معرکۃ آلارا تاریخی مقالات پر مشتمل ہے جو انھوں نے یورپ کے مستشرقین اور تنگ نظر ہندو مورخوں کے جواب میں الندوہ اور دوسرے بلند پایہ رسالوں میں لکھے تھے، مثلاً کتب خانہ اسکندریہ اور مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائی وغیرہ۔

قیمت :- .... ۱۱ روپیے

دیوانِ صلائی

از پروفیسر ڈاکٹر امیر حسن عابدی، دہلی یونیورسٹی

تذکرۂ شمع انجمن اور ریاض العارفین کے مولفین نے امیر جلال الدین حسن متخلص بصلائی کا ذکر کیا ہے، نیز ان کو سادات شہرستان میں سے بتلایا ہے ان کو اصفہانی بھی لکھا گیا ہے، تذکرہ نویسوں کے قول کے مطابق وہ شاہ عباس[1] کے زمانہ میں صدارت کے عہدے پر فائز ہوئے، مگر ۱۰۲۰ھ (۱۶۱۱-۱۲ء) میں ان کو معزول کر دیا گیا، ان دونوں تذکروں میں ان کے یہ شعر دئے ہوئے ہیں:-

خدا شکیب دہد این دلِ پریشان را   کہ بر شکستہ دلان رحم نیست خوباں را

مصریاں انصاف می خواہم کدامیں بہتر است   آفتاب یزد ما یا ماہِ کنعانِ شما

جور و جفا اگر ز پئے آزمودن است   از من نماند خود اثر این امتحان کیست

سعی طبیب ہرزہ بود بہر چارہ ام   مرہم کجا و این جگر پارہ پارہ ام

از ملک دل بپرس خبر کاندریں دیار   صاحب تصرفیست کہ من ہیچ کارہ ام

پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شیرانی کلکشن میں دیوان صلائی کا ایک قلمی نسخہ موجود ہے۔[2] جو خراب حالت میں ہے، نیز اوراق الٹے پلٹے ہوئے۔ اور بہت سے غائب ہیں، اس سے اس کے مطالعہ میں زحمت ہوتی ہے۔

---

[1] ۹۹۶-۱۰۳۸ھ ۱۵۸۸-۱۶۲۹ عیسوی [2] شمارہ ۲۶۲۷/۱۵۷۷

فہرست شیرانی کے مؤلف نے صاحب دیوان کا نام احسن بیگ لکھا ہے۔ جب کہ خود نسخہ میں حسن بیگ دیا ہوا ہے۔ یہ نسخہ ۱۰۱۷ھ (۱۶۰۸-۹ء عیسوی) میں لکھا گیا، اور اسکا کاتب عبد الرحیم ولد سید نجم الدین ہے۔ غالباً یہ نسخہ خود شاعر کی زندگی کا ہے۔ بہر حال یہ صلائی، شمع انجمن وغیرہ کے صلائی سے مختلف ہیں۔ اس لیے کہ وہ صلائی سادات شہرستان میں سے تھے۔ جب کہ ان کو بیگ بتلایا گیا ہے۔ نیز ان صلائی کا شہرستان سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ دوسری جگہ کے رہنے والے تھے۔ ان صلائی کے متعلق تذکروں سے کوئی پتہ نہیں چلتا اور تذکرہ نویسوں نے انکا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ خود اس دیوان کے پڑھنے سے انکی زندگی کے خد و خال درست کیے جا سکتے ہیں۔

جیسا کہ خود ان کے اس قطعہ سے معلوم ہوتا ہے، وہ ۹۵۵ھ ہجری (۱۵۴۸-۴۹ء عیسوی) میں ساحل مرغاب میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی تربیت اسفراین میں ہوئی ۹۸۱ھ (۱۵۷۳-۷۴ء عیسوی) میں وہ ہندوستان آنے کے لیے بے چین ہوئے۔ اور رخت سفر باندھا۔ لیکن یہاں ان کو وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی۔ جس کی وہ امیدیں لے کر آئے تھے۔ نیز یہاں ان کو نشیب فراز دیکھنے پڑے۔ ۹۹۹ھ ہجری (۱۵۹۰-۹۱ء عیسوی) میں ان کو کسی بڑی کامیابی کی امید تھی۔ مگر اسکی نوعیت کا اس سے پتہ نہیں چلتا۔ البتہ ایک دوسرے قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس سال حج کے لیے گئے تھے۔

بسال نہصد و پنجاہ و پنج از ہجرت — زشہر بند عدم آمدم بملک وجود
بود مقام تولد بساحل مرغاب — ولیک نشو و نمایم باسفراین بود
چرا کہ آن وطن اصلی پدر بود و مرا — قضا بآن ... سیر آن وچمن فرمود
چو سال نہصد و ہشتاد و یک شد از تاریخ — ہوای ہند عنان دلم زکف بر بود

دلی بہند نشد حاصل آنچہ دل می خواست — بمدرار چہ نشیب و فراز رو بنمود
بہ نہصد و نود و نہ بروز عید ضحیٰ — بدر کعبۂ امید بخت دیدہ کشود
بیادگار زمن گر نماند فرزندی — کہ جانشین بود م چون جہان کنم پدرود
دلی باین دل خود شاد می کنم کہ بدہر — نمردہ آنکہ ہمرا یند گفتہ اش بسرود

دوسرا قطعہ یہ ہے:۔

بروز جمعہ ذی القعدہ نہصد و نود و نہ — مذاق سعی گرفت از لب ..... کام
پئے طواف حرم چون صلائی مہجور — بربست صدق یقین پیشہ نیت احرام

اس دیوان میں ایسے قصیدے ہیں، جو شاید ہندوستان کی زندگی سے تنگ آکر صلائی نے شاہ عباس کی مدح میں کہے تھے اور جنہیں ایران کو جنت سے بہتر بتلایا گیا تھا۔ نیز شاعر نے ان میں تنگدستی کا ذکر کیا ہے۔

آنقدر زلت کہ در عہدت نہ عمر شی می کنم — گر کنم تقریر از اظہار خجالت می کشم
ملک ایران رشک جنت گشتہ از عباس شاہ — بار عایت رخت تا آن رشک جنت می کشم

بس بگو عباس شاہ و حرف از اعدا مدار — کس سزاوار ست شرق و غرب و زیر نگین

ان کے علاوہ کئی قصیدے اکبر کی تعریف میں ہیں، جو حتماً ۹۸۱ھ ہجری (۱۵۷۳-۷۴ء عیسوی) کے بعد کہے گئے ہوں گے۔ مثلاً کہتے ہیں[1]:۔

بدرگہ شہنشہ اکبر کہ باد بخشش — فیروز بر اعادی مفتاح بر مشاکل
خدیو ملک ظفر کامیاب اکبر شاہ[2] — کہ می سزد خدمش را خطاب خاقانی

مگر زیادہ تر قصیدے شاہزادہ سلیم کی شاہزادگی کے زمانہ میں انکی تخت نشینی پر

---

[1] ۹۶۳ - ۱۰۱۴ ہجری / ۱۵۵۶ - ۱۶۰۵ عیسوی

اور جہانگیر بادشاہ بننے کے بعد مختلف موقعوں پر کہے گئے ہیں۔ قصیدوں کے بعض اشعار یہاں نقل کیے جا رہے ہیں :۔

نورالدین خسرو جہانگیر — شد شاہ سلیم ابوالمظفر
شاہنشہ خسرو جہانگیر — دارای سریر و عز و اکرام

یہاں رہ کر صلائی دکن میں قطب شاہی دربار تک بھی پہنچے تھے۔ نیز انھوں نے محمد قلی قطب شاہ کی مدح میں ایسے قصیدے کہے ہیں :۔

شہ سپہر مکان قطب شاہ آنکہ بود — فلک متابعش و روزگار فرماں بر
صاحب قران خدیو محمد قلی شہ آنکہ — با امر و نہی اوست قرین چرخ و اخترش

ان کے علاوہ انھوں نے احمد سلطان محمد سلطان نامی بادشاہ کی بھی ذیل کے قصیدے میں تعریف کی ہے۔ مگر ٹھیک سے پتہ نہیں چلتا کہ ان سے کون مراد ہے :۔

رسید مژدہ کہ نو گشت دہر را بنیان — بعہد احمد سلطان محمد سلطان

ممکن ہے کہ ان سے مراد عثمان بادشاہ احمد اول ہوں۔

بادشاہوں کے علاوہ صلائی نے امرا کی بھی تعریف کی ہے، جن میں سے خاص طور سے میرزا ابوالقاسم کی توصیف کی گئی ہے۔ ان کا نام بار بار ان کے قصیدوں میں لیا جاتا ہے، مثلاً کہتے ہیں:

۱؎ ۱۰۱۴ - ۱۰۳۶ ہجری / ۱۶۰۵ - ۱۶۲۶ عیسوی۔ ۲؎ ۹۸۸ - ۱۰۲۰ ہجری / ۱۵۸۰ - ۱۶۱۲ عیسوی ۳؎ احمد اول سلطان عثمان۔ ۱۰۱۲ - ۱۰۲۶ ہجری / ۱۶۰۳ - ۱۶۱۶ عیسوی ۴؎ آتشکدۂ آذر میں لکھا ہوا ہے کہ آپ اصلاً گلستانۂ اصفہان کے سادات میں سے تھے، مگر خود ترکستان میں پیدا ہوئے اور کابل میں نشو و نما پائی، اس وجہ سے کابلی کہے جاتے ہیں، ہمایوں بادشاہ کے زمانہ میں آپ ہندوستان آئے اور آخر [illegible] بسر کرتے رہے۔ آخر میں آپ فقرا کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ آپ شاعر بھی تھے، چنانچہ اس تذکرے میں ان کے کئی شعر دیے ہوئے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

چوں سایہ ہمرہم ہمہ جا رواں شوی — شاید گرفتہ رفتہ بما مہرباں شوی

محی دین و دول میرزا ابوالقاسم — کہ امر و نہی خدا را ز جان بود مامور
عظیم الرتبہ سعد اختران مرزا ابوالقاسم — کہ دیہیم صدارت راست او زیبندہ فرہنگی

ان کے علاوہ انھوں نے خان اعظم،[1] اعظم خان، مقرب خان، مرتضیٰ خان احمد، حافظ کنبایت مصطفیٰ خاں[2] وغیرہ کا بھی ذکر کیا اور انکی مدح کی ہے۔

شمس دین و دول آن گزشتہ دودانش خطا — بہر تعظیم جہانگیر قلی خان آمد
خلف دودۂ اقلیم ستان اعظم خان — کہ چو اجداد زمینی دل حیران آمد
فرید عہد تولی خان مرتضیٰ القاب — ز لطف شاہ جہانگیر بخت فرخ فر
مسلم ورع اوست مصطفیٰ خانی — بصدر مسند دانش ز آل پیغمبر
تہمتن صف نام آوران مقرب خان — کہ از علو شرف ہست واجب التعظیم
بو علی زماں مقرب خان — کہ از و ملک شاہ راست نظام
نوائی حافظ کنبایت ار مصاحب خان — چو شہر لوطاہی گشت سر بسر ویران

بعض لوگ اتنے بڑے تو نہ تھے کہ ان کی شان میں قصیدے کہے جائیں، لیکن قطعوں میں ان کا ذکر اور انکو یاد کیا گیا ہے، مثلاً ہاشم دلال اور کسی مرزا یحییٰ نامی کا بڑے اخلاص سے نام لیا اور ان کو سلام پہنچایا گیا ہے :۔

خدمت اخد التسزامی ہاشم سمسار را — اے صبا از ما دعا گو با مہین مدام
اے صبا رفتہ بہ مرزا یحییٰ — عرض اخلاص صلائی برسان

کسی شاہ جی کا بھی ذکر کیا گیا ہے :۔

۱؎ مرزا عزیز کوکہ وفات ۱۰۳۳ ہجری ۱۶۲۳-۲۴ عیسوی ۲؎ مصطفیٰ خاں خلف سہراب خان موصیلو آن قونیلو ترکمان و مصطفیٰ بیگ ترکمان خان، و وفات ۱۰۴۳ ہجری ۱۶۳۳-۳۴ء

شاہ جی با چند دیگر داخلند اما فلاں	زال می گوید فغاں از میرزا خان می کند

مگر دوسری طرف انھوں نے کسی خواجہ حسین کے لڑکے کی اس طرح مذمت بھی کی ہے:۔

سرفراز از ابن خواجہ حسین	ہست بیحد عذاب روح مرا

کسی کاشانی کے لیے کہتے ہیں:۔

اگرچہ کاشیت ملی علت قمی دارد	باوجود مثل زفلانست فلاں

حسب ذیل تین قطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں کسی چغلخور کی وجہ سے ایک امیر نے اپنے پاس سے ہٹا دیا تھا پھر یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ انھیں کوئی وظیفہ ملتا تھا جو بند کر دیا گیا تھا:۔

ایا سپہر مروت دو سالی شد کم و بیش	کہ از عطا نرسیدہ بہ مخلصاں معتاد

قبلہ گاہا امید آنم بود	کہ بپرسد ترحمت یکبار

کہ فدای محب دیرینہ	از چہ دارد ز بزم وصل کنار

زین تغافل گمان شدہ کہ مرا	کہ از زبان بوی نقار

خوردہ بر گوش الفت حرفے	کہ چنین خاطرت بگرفت غبار

مشیخت تبار احکومت شعار را	بمنع وظایف دل ما مرنجان

اس دیوان میں کچھ اور تاریخیں بھی دی ہوئی ہیں، مثلاً قطب الاقطاب شیخ داؤد نے ۱۹ ربیع الاول ۱۰۱۱ھ ہجری (۱۶۰۲ء عیسوی) کو انتقال کیا تو یہ قطعہ کہا گیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۱۰۱۱ھ ہجری تک صلائی حتماً زندہ تھے:۔

در شانزدہ ربیع الاول	شد جانب خلد شاد و خوشنود

آن قدرۂ کشور سعادت	قطب الاقطاب شیخ داؤد

تاریخ وفات از صلائی	جستم ہزار و سیزدہ بود

اس قطعہ میں اول ماہ صفر میں کسی کی ولادت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر پتہ نہیں چلتا کہ اس سے کون مراد ہے، نیز صرف مہینہ دیا ہوا ہے، سال بیان نہیں کیا گیا ہے،

اول ماہ صفر تازہ گلی	رو بنمود ز بستان عدم

ممکن ہے کہ خود ان کے لڑکے کی ولادت کا ذکر ہو، جو بعد میں شاید زندہ نہ رہ سکا۔

دیوان کے مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہندوستان میں صلائی زیادہ تر گجرات میں اقامت پذیر رہے ہیں، نیز اس قصیدہ میں انھوں نے خان اعظم کے وہاں جانے پر مسرت کا اظہار کیا، اس لیے کہ اس سے قبل وہاں کے ارباب ظلم و ستم نے اسے ویران کر دیا تھا،

باد معمور زمین قدم معدلتی	ملک گجرات کز ارباب ستم ویرانست

کیست آن باعث آسایش عالم دانی	آنکہ در کشور ادراک ز ممتاز انست

خان اعظم کہ بود مصر عزیزش آباد	کز شرف مرکز احسان ہنرمندانست

وہ کوکن کے علاقہ میں بھی رہے ہیں، جہاں کے قحط کا وہ اس طرح ذکر کرتے ہیں:۔

عدل آثار بکوکن امسال	گویند کہ کم بود باران

آیا شدہ اینکہ نیست پیدا	از غلہ اثر گران وارزان

صلائی کے کلام میں بار بار انکی عسرت کا ذکر آتا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ افلاس کی زندگی بسر کرتے رہے پھر بھی کسی احسان کے متمنی نہیں ہیں:۔

ہر چند کہ مفلسم و شاعر	از منت خلق بی نیازم

مفلس لیک صلائی صفت از گنج خرد	متمول تر از اندیشہ صد قارونم

البتہ ممسک اور بخیل لوگوں کی مذمت ضرور کرتے ہیں:۔

در کشور سخا چو صلائی بدست جور	فرمان بقتل والی امساک دادہ ایم

صلائی کو حضرت علیؓ[1] اہل بیت اور ائمہ سے بڑی عقیدت تھی، نیز خراسان سے جہاں امام رضاؓ[2] مدفون ہیں بڑا لگاؤ تھا :۔

باصلائی بدر سرعت تسخیر وصال　　قرعۂ طوف تخت بر در بغداد و زدیم

چون صلائی قدمی در ردش سی نہیم　　عہدی از مرحمت ساقی کوثر گیریم

صلائی شاعری میں اپنے کو فردوسی[3]، انوری[4]، اسمٰعیل اصفہانی[5]، کمال خجندی[6] سے کم نہیں سمجھتے تھے، اور ان کو اپنی شاعری پر فخر تھا، نیز ان کو شکایت تھی کہ انکی وہ قدر نہ ہوئی جسکے وہ مستحق تھے :۔

شعر حسن کسادبازار ست　　ورنہ بود زبان ناطقہ لال

غوص بحر بیان خجندی وار　　می نمودم بہمرہی خیال

کردمی چارسوے معنی را　　زینتی بہ زانوری و کمال

گفتمی ہجو طوسی استاد　　قصہ بند نقل رستم و زال

عمریست کہ اقلیم سخن راصرہ کاریم　　صراف سرچار سوی ملک واقالیم

اس غزل میں کہتے ہیں :۔

گفت صلائی این غزل دوش بعد یہ نیم شب　　لوح قلم بہ ثبت آن بردہ گواہ کردہ ام

اس قصیدہ میں شاعر نے ایک ہندی محاورہ "بات ٹالنا" فارسی میں استعمال کیا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کو یہاں کی مقامی زبان سے کافی آشنائی ہوگئی تھی۔

---

[1] شہادت۔ ۴۰ سنہ ہجری / ۶۶۱ سنہ عیسوی [2] وفات ۲۰۳ سنہ ہجری / ۸۱۹ سنہ عیسوی

[3] وفات ۴۱۱ یا ۴۱۶ سنہ ہجری / ۱۰۲۰-۱۰۲۵ عیسوی [4] وفات ۵۸۳ سنہ ہجری / ۱۱۸۷ سنہ عیسوی۔

[5] وفات۔ ۶۳۵ سنہ ہجری / ۱۲۳۷-۸ سنہ عیسوی [6] وفات ۸۰۳ سنہ ہجری / ۱۴۰۰-۱ سنہ عیسوی

آرزو با امید بی پایان　　گرم افغان ہمی رسد بپایان

مشکل طرفہ فتاد ستش　　بگرم کوہ جواب آسمان

داور اخود پسند احسانست　　ناامیدی شاعر از اعیان

باز از لطف چون تو فتانی　　کہ نداری قرینہ از اقران

ہیچگہ این شنیدہ گردیدت　　کہ کند راچہ بات راٹالان

صلائی کا کلام متوسط درجہ کا ہوتا ہے۔ ان کے قصیدوں کے بہت سے اشعار نقل کئے جا چکے ہیں، جن سے ان کی قصیدہ گوئی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، بدقسمتی سے اس ناقص نسخہ میں ان کی غزلیں بہت کم ہیں، اس لیے اس کے عمدہ نمونے نہیں دیئے جا سکتے، آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ اس دیوان کے دقیق مطالعہ سے ہمارے ہندوستان کی تاریخ کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑ سکے گی۔

تاریخِ جہانگیر

از

جناب عبدالرؤف خاں صاحب ایم اے ہسٹری اردوئی کلاں راجستھان

ڈاکٹر بینی پرشاد نے جہانگیر پر ۱۹۲۲ء میں ایک بلند پایہ کتاب لکھی تھی جو ہسٹری آف جہانگیر کے نام سے آج تک ہمارے ملک کی اکثر یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل ہے، اس کی اہمیت کے پیشِ نظر ترقی اردو بورڈ، وزارت تعلیم و سماجی بہبود، حکومتِ ہند نے اس کو جناب رحم علی الہاشمی صاحب سے اردو میں ترجمہ کروایا، اور ۱۹۷۹ء میں تاریخِ جہانگیر کے نام سے شائع کیا،

راقم الحروف کو ترجمہ سے جو مایوسی ہوئی اُس کا اندازہ قارئین یہ تبصرہ پڑھنے کے بعد ہی لگا سکتے ہیں، اس میں زبان و بیان کی خامیاں ہیں، اور پھر متعدد مقامات پر تاریخی واقعات و سنین کو صحت کے ساتھ بیان نہیں کیا گیا اس سے کتاب کی تاریخی روح مجروح ہو گئی ہے، نیز بہت سے انگریزی فقروں کا ترجمہ کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی گئی ہے،

اسی طرح کتاب کے ص ۷ پر مآثر جہانگیری، اور الفنسٹن کو دو دو دفعہ مآثر جہانگیری اور الفنسٹن لکھا گیا ہے، ص ۸ پر سینٹ زیویر لائبریری کلکتہ کی بجائے سینٹ زیویرس کالج کلکتہ لکھنا چاہیے تھا، اور جین سدھانت بھون آرہ کے بعد انڈیا آفس لندن نیز لالہ سری رام کے بعد ایم اے کتابت سے رہ گیا ہے، ص ۹ پر ہی اصل مقالہ کے دوسرے ایڈیشن کے

پیش لفظ کے خلاصہ کا اور تیسرے ایڈیشن کے پیش لفظ کے نوٹ کا ترجمہ جو صرف ایک جملہ کا تھا چھوڑ دیا گیا، غالباً فاضل مترجم نے صرف پہلے ایڈیشن کو سامنے رکھ کر ہی ترجمہ کیا ہے،

صفحہ ۹ پر تاریخوں کی تشریح کے عنوان کے تحت اسلامی مہینوں کے آگے قوسین میں دنوں کی تعداد نہیں دی گئی جب کہ انگریزی زبان کے نسخہ میں موجود ہیں، اس نقص کو دیکھ کر بعض دیگر مشکوک مقامات پر ترجمہ کا اصل نسخہ سے مقابلہ کیا، تو معلوم ہوا کہ مختلف مقامات پر انگریزی کے کئی فقروں کا ترجمہ نہیں دیا گیا ہے، ممکن ہے ایسا سہواً ہوا ہو مگر ہم اسے بے توجہی پر محمول کرتے ہیں، مثال کے طور پر اسی صفحہ نمبر ۹ کے ایک ڈھائی سطر کے پیراگراف کا ترجمہ دینا ضروری نہیں سمجھا گیا، جو نہایت اہمیت کا حامل تھا، ص ۱۱ پر بیرم خاں کے بارے میں (۱۵۵۳ء تا ۱۵۶۰ء) کے بجائے (۱۵۵۵ء تا ۱۵۶۰ء) اور ہمایوں کے سلسلہ میں (۱۵۴۳ء تا ۱۵۵۳ء) نیز (۱۵۵۲ء تا ۱۵۵۶ء) کے بجائے (۱۵۳۰ء تا ۱۵۴۲ء) نیز (۱۵۵۵-۵۶ء) ہونا چاہیے، فاضل مترجم کے ذریعہ دی گئی مدت نہ اصل نسخہ کے سنہ و سال سے مطابقت رکھتی ہے اور نہ تاریخی حقیقت سے، اسی ص کے حاشیہ نمبر ۱ پر گلبدن (ص ۱) نے ۱۵ اگست لکھا ہے، اور پرائس (ص ۳) نے ۲۷ جون لکھا ہے، ...... کی بجائے گلبدن (ص ۱) نے ۹ اگست لکھا ہے، اور پرائس (ص ۴) نے ۷ شعبان لکھا ہے، ...... ہونا چاہیے، تاریخ ماہ و سال کا غلط یا خلاف واقعہ اندراج نہ صرف ص ۱۱ پر ہی ہوا ہے، بلکہ دیگر صفحات پر بھی ہے جس کا بیان حسبِ موقع آئے گا،

ص ۱۲ پر جنوری ۱۵۶۳ء کے بجائے جنوری ۱۵۶۲ء ہونا چاہیے، اسی صفحہ اور اس کے حاشیہ نمبر ۲ میں راجہ بھارمل (Bharmal) کو بھارا مل اور انبیر کو امبیر لکھا ہے یعنی صحت املا کی طرف توجہ بالکل نہیں کی گئی، امراء کو جا بجا 'امرا' تحریر کیا ہے، اسی صفحہ ۱۲ پر ۱۵۶۲ء

تا ۱۵۶۶ء کے بجائے ۱۵۶۲ء تا ۱۵۶۶ء لکھنا چاہئے تھا، ص ۱۳ پر حضرت خواجہ فضیل بن عیاضؒ کا املا فضیل بن ایاز لکھا ہے، ص ۱۴ پر Sufism کا ترجمہ صوفیت کیا ہے، جو غیر فصیح ہے، بجائے اس کے تصوف ہونا چاہئے تھا جو فصیح تر ہے، اسی صفحہ پر ایک فقرہ "دل کی دل کی راہ سے" لکھا ہے، جو ناقابل فہم ہے، یہ Heart to heart کا ترجمہ ہے، یہاں سینہ بہ سینہ ہونا چاہئے تھا، جو سریع الفہم ہے، ص ۱۴ پر ہی "... واپس آئے تو مذہبی حلقوں میں جوش بھر اٹھا" کی بجائے "... واپس آئے تو علمی اور مذہبی حلقوں میں جوش بھڑک اٹھا" لکھنا چاہئے تھا، اسی صفحہ پر حضرت شیخ سلیم چشتیؒ کی زندگی کے بارے میں ایک اصل فقرہ اس طرح لکھا ہوا ہے "یہاں وہ سچے ولی اللہ کی طرح زہد و تقویٰ میں بسر کرتے تھے"، سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فقرہ سے لفظ "زندگی" چھوڑ دیا گیا ہے، در اصل فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا، "یہاں وہ قرونِ وسطیٰ کے ایک سچے ولی اللہ کی طرح زہد و تقویٰ میں زندگی بسر کرتے تھے" یعنی لفظ Medieval کا ترجمہ بھی نہیں کیا گیا، ص ۱۴ پر ہی شیخ موصوفؒ کی کرامات کے ضمن میں یہ ملاحظہ فرمائیے، "عوام میں اُن کے بہت سے معجزے مشہور ہو گئے تھے"، اردو کا عام قاری بھی معجزے کی اصطلاح سے بخوبی واقف ہے کہ یہ صرف انبیائے کرامؑ کے ساتھ مخصوص ہے، اولیاء اللہؒ سے صادر ہونے والی خرقِ عادات کو کرامات کہا جاتا ہے، ص ۱۴ کے حاشیہ نمبر ۷ میں "بلوخ مین" کو "بلوک مین" لکھا ہے،

ص ۱۵ کے حاشیہ نمبر ۹ میں "سبحان رائے" کو "سیجان رائے" لکھ کر کاتب نے اپنی جدت کا ثبوت دیا ہے، ص ۱۷ پر ایک فقرہ اس طرح ارقام فرمایا ہے، "دی مستقبل کا بدانجام قطب الدین" یہ انگریزی کے حسب ذیل فقرہ کا ترجمہ ہے،

The future ill fated Qutbuddin

ص ۱۰ پر ۲۱ نومبر ۱۵۶۹ء سے پہلے on Sunday کا ترجمہ موصوف کی نظروں سے اوجھل ہو گیا، اسی صفحہ پر بی بی دولت شاد کو بی بی دولت شاں لکھا ہے،

ص ۲۴-۲۵ پر بابر کے علمی اوصاف کے سلسلہ میں ایک فقرہ یوں مندرج ہے، "اس نے اصول قانون پر ایک نہایت ہی مفید کتاب تصنیف کی جو خوش اسلوبی میں اس فن کی دوسری کتابوں پر فوقیت رکھتی ہے" بادی النظر میں فقرہ صحیح ہے لیکن اس کا موازنہ انگریزی کے اصل فقرہ سے کر کے دیکھئے، جو حسب ذیل ہے،

"....and was the author of a most useful treatise on jurisprudence which has been adopted generally." P.14 Third Edition.

انگریزی کے مندرجۂ بالا فقرہ کے بعد حسب ذیل فقرہ کے ترجمہ کرنے کی زحمت نہیں کی گئی،

"He also wrote a tract on Turki prosody superior in elegance to any other, and put into verse the Risalah-i walidiah of His Holiness. (History of Jahangir P. 14. Third Edition.)

خط کشیدہ حصہ کا ترجمہ اردو کے ص ۲۴-۲۵ کے فقرہ میں غیر ضروری طور پر شامل کر دیا ہے، لیکن انگریزی کے اس فقرہ کو عمداً نظر انداز کیا ہو، یہ فقرہ رسالۂ والدیہ حضرت خواجہ عبیدؒ کے ضمن میں ہے جو بابر نے ۹۳۵ھ میں اپنی علالت کے دوران میں صحت یابی کے لئے مولانا عبدالرحمٰن جامی کے سبحہ کی طرز پر لکھا تھا جس میں کل باون ۵۲ شعر ہیں، پورا رسالہ وزن رمل مسدس میں،

مجنون و ضرب اور ابتر و مجنوں محذوف میں ہے،

صفحہ ۲۴ کے حاشیہ ۲۶ میں (الیس در اس) اور ص ۲۵ کے حاشیہ نمبر ۲۸ میں (الیاس و راس) تحریر کیا ہے، بہتر ہوتا کہ کوئی املا اختیار کر لیا جاتا، ص ۲۴ کے ہی حاشیہ ۲۴ میں اسکرین اینڈ راس کی بجائے اسکراین اینڈ راس (Skrine and Ross.) ہونا چاہیئے،

ص ۲۶ پر Kalhan's Rajatarangini کا ترجمہ عجیب انداز میں کیا ہے، یعنی کلنس کی راج ترنگنی، کلھن کو کلنس بنا کر اردو اور انگریزی کی اضافتوں کے حسین امتزاج کو اردو میں رائج کرنے کی جسارت کی گئی ہے، اسی صفحہ پر انگلش کے مندرجہ ذیل دو فقرے تشنۂ ترجمہ رہ گئے ہیں،

"The Ain-i-Akbari, a veritable Imperial Gagatteer was on absolutely unique administrative and statistical record till the nineteenthe century
The Lilavati famus Sarsprit work on mathe-matics, was translated in to persian"
ion' Ibid P.15.

ص ۳۱ پر (بقیہ ح ص ۳۰) انند خان کو "انندن خان" لکھا ہے، ص ۳۵ کے بقیہ حاشیہ ص ۳۴ میں بانبراٹ کی کمینٹریس صفحات ۵۸ - ۲۴۲ و نسنٹ اسمتھ (اکبر ص ۴۱) نے بھی یہی لکھا ہے" کی بجائے بانسیراٹ کی کمینٹریس ص ۶۴۲ - ۵۵۸ و نسنٹ اے، اسمتھ (اکبر ص ۴۱) اور بار ٹولی (ص ۴۴ - ۵۹) نے بھی یہی لکھا ہے'

ہونا چاہیئے، اسی حاشیہ میں ..... ۱۵۸۶ء ہوا" کی بجائے ۱۵۸۶ء میں ہوا، اور جس سے اس کی شادی بہت بعد میں ہوئی، کی بجائے جس سے اس کی شادی بہت بعد یعنی ۱۶۱۱ء میں ہوئی ہونا چاہیئے ص ۲۶ پر ..... ۱۲ فروری کو راجہ کے محل پر گیا کی بجائے، ..... ۱۳ فروری ۱۵۸۵ء لکھنا چاہیئے تھا، یہ شہزادہ سلیم اور مان بائی بنت راجہ بھگوان داس (انبیر) کی شادی کا سنہ ہے، ص ۲۷ کے حاشیہ ۳ میں جہانگیر (راجرس اور بیوریج) ص ۵ جلد اول میں اُسے صرف اولاد اکبر لکھا ہے"

فقرہ سلطان النساء بیگم بنت جہانگیر کی پیدائش کے سلسلہ میں ہے، جو جہانگیر کی پہلی اولاد تھی، مگر فقرہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ اکبر کی اولاد تھی، لہٰذا" فقرہ یوں ہونا چاہیئے تھا، جہانگیر نے (راجرس اینڈ بیوریج ص ۵ جلد اول میں اسے صرف اولادِ کبریٰ لکھا ہے،" ص ۳۰ پر ایک فقرہ اس طرح لکھا ہوا ہے،" پھر بیکانیر کے رائے رائے سنگھ کی لڑکی اور سعید خاں گھکہ کی لڑکی" سیاق و سباق پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ اس فقرہ کو اس طرح ہونا چاہیئے تھا،" پھر بیکانیر کے رائے رائے سنگھ کی لڑکی اور سعید خاں گھکر کی لڑکی سے شادی کی، اسی طرح ص ۳۹ پر اس فقرہ کی فصاحت غور طلب ہے' داشتہ عورتوں کو ملا کر حرم کی تعداد بے پناہ تین سو تک پہونچ جاتی ہے،" عدد کے ساتھ بے پناہ کی صفت پہلی دفعہ نظر سے گذری ہے، فقرہ یوں ہونا چاہیئے تھا" داشتہ عورتوں کو ملا کر حرم کی تعداد تین سو کے کثیر عدد تک پہونچ جاتی ہے"

ص ۴۲ پر شہزادہ مراد اور دانیال کے منصب کا ذکر یوں کیا گیا ہے"..... حالانکہ اس کے بھائی مراد اور دانیال کو سات سو اور چھ سو کے منصب دیئے گئے، اس موقع پر شہزادہ سلیم کو دس ہزار کا منصب عطا ہوا تھا، حیرت ہے کہ پھر مراد اور دانیال کو نسبتاً نہایت حقیر منصب دیئے گئے، لہٰذا انگریزی نسخہ سے موازنہ کرنے پر معلوم ہوا

کہ مراد اور دانیال کو علی الترتیب سات ہزار اور چھ ہزار کے منصب عطا کئے گئے تھے جو شاہزادوں کے شایانِ شان تھے، فاضل مترجم نے دیگر صفحات پر بھی مناصب، علی الخصوص ذات وسوار کے سلسلہ میں بھی اعداد و شمار کو صحت کے ساتھ نہیں لکھا ہے جس کا ذکر حسب موقع آئے گا، اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱۸ میں "تمن تاغ" کو "تمن باغ" تحریر فرمایا ہے، تمن باغ جیسی تاریخی اصطلاح ہمارے محدود مطالعہ میں نظر سے نہیں گذری، ص ۴۴-۴۳ پر ابو الفضل کے اوصاف کے سلسلہ میں ایک جملہ اس طرح ہے، اس کے ذہن میں ہر مذہب کی کوئی نہ کوئی جاگزیں ہو گئی تھی، یہاں لفظ جاگزیں سے پہلے Good کا ترجمہ (خوبی) نہیں کیا گیا، اس طرح یہ جملہ مہمل ہو گیا ہے، صفحہ ۴۴ پر..... سارا قصہ غیر مذہبی تھا، غیر مذہبی بنیاد پر لڑا گیا کی بجائے..... سارا قصہ غیر مذہبی تھا، اور سراسر غیر مذہبی بنیاد پر ہی لڑا گیا، نیز اسی صفحہ پر اس سے اگلا ہی فقرہ "جو کچھڑی اس سال پک رہی تھی" کی بجائے "جو کچھڑی دس سال (Fora decade) سے پک رہی تھی، لکھنا چاہئے تھا، ص ۴۹ پر ۱۵۸۱ء کے بجائے ۱۵۸۰ء اور "شیچی" کی بجائے "پرچی" (Peruschi) نیز "بانسراٹ" کی بجائے "مانسراٹ" اور اسی صفحہ کے آخری فقرہ "سیاسی ماحول کو مختل کرنے کافی تھی" کی بجائے "سیاسی ماحول کو مختل کرنے کے لئے کافی تھی" ہونا چاہئے تھا،

ص ۵۱ کے حاشیہ نمبر ۲ میں..... و ق کر دیا گیا، کی بجائے "اور عاق کر دیا گیا" یعنی "اور عاق" صحیح طور پر چھپنے سے رہ گیا ہے، ص ۵۳ پر مریم زمانی کو سلیم کی دادی بتلایا ہے، اور ص ۱۵ پر ماں۔ اصل میں ص ۵۳ پر مریم مکانی لکھنا چاہئے تھا، تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کو علم رجال سے قدرے شغف رکھنا ضروری ہے، ص ۵۶ پر حاشیہ نمبر ۱۶ (حاشیہ نمبر مندرج نہیں کیا) میں دھوکر ساہ کو "دھوکرہ" تحریر کیا ہے،

ص ۵۹ پر جبار خاں کی بجائے جبار خاص خیل لکھنا چاہئے تھا، ص ۶۵ پر....... ناعاقبت اندیش ہم صحبتوں کے کٹ پتلی بنا ہوا تھا، کی بجائے..... ناعاقبت اندیش ہم صحبتوں کی کٹ پتلی بنا ہوا تھا، ہونا چاہئے تھا، اسی صفحہ پر ابو الفضل کا سنہ وفات خلاف واقعہ ۱۶۰۴ء لکھا ہے، جسے اگست ۱۶۰۲ء ہونا چاہئے تھا، خان اعظم مرزا عزیز کوکہ کو متعدد مقامات پر..... کوکا لکھا ہے، ص ۷۰ پر سلطان خسرو کے بارے میں ایک فقرہ یوں تحریر فرمایا ہے..... جو سیاسی جھگڑے اس کے گرد پیش ہو رہے تھے، ان سے اس میں حصول اقتدار کے دو بخوشی اپنے چچا اور خسر کی جماعت میں شامل ہو گیا" پورا فقرہ فصاحت سے عاری اور بعید از فہم ہے، قارئین لفظ چچا پر بھی غور فرمائیں، جو راجہ مان سنگھ کے لئے استعمال ہوا ہے تاریخ کا ادنی طالب علم بھی جانتا ہے کہ راجہ مان سنگھ شہزادہ کا چچا نہیں، ماموں تھا،

ص ۷۲ پر ایک حیرت انگیز فقرہ ملاحظہ ہو، ۱۶۰۴ء میں اکبر کے بھائی ابو الخیر کو بھی بھیجا" ابو الخیر فیضی وابو الفضل کا بھائی تھا، جو نسبتاً کم مشہور ہے، ص ۷۳ سے ص ۷۶ تک کے صفحات کی ترتیب معکوس ہو گئی ہے، یعنی ص ۷۳ کے بعد ص ۷۶ کا اور پھر ص ۷۴ کا نیز ص ۷۵ کے بعد ص ۷۷ کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے، اسی طرح ص ۱۹۹ سے ص ۲۰۲ تک کے صفحات کی عبارت بے ربط ہو گئی ہے، دونوں مقامات پر قاری کو ترتیب قائم کرنے میں دقت اور جھنجھلاہٹ محسوس ہوتی ہے، ص ۸۴ پر ایک فقرہ یوں درج ہے "شہزادہ کی سوتیلی ماں، مائیں اور بہنیں اس سے ملیں، فقرہ سے صاف طور پر مترشح ہوتا ہے، کہ شہزادہ کی کئی مائیں تھیں، فی الواقع یہاں فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا "شہزادہ کی سوتیلی مائیں، ماں اور بہنیں اس سے ملیں" ص ۹۱ پر بادشاہ کی مرضی کے کوئی شادی کا رشتہ قائم کریں کی بجائے "بادشاہ کی مرضی کے خلاف کوئی شادی کا رشتہ قائم کریں" اور ص ۱۲۰ پر انل رائے دلان

کی بجائے انل رائے سنگھ دلان، نیز ہندو خاتون' اور قانون والوں کی بجائے 'ہندو قانون' اور قانون دانوں لکھنا چاہئے، ص ۱۳۰ پر ماوراء النہر' ماوراء البحر بنا دیا ہے، اسی صفحہ پر ایک بے معنی فقرہ یوں ملتا ہے، "مگر یہ طمطراق کا مراسلہ عالمگیر امن و صلح کا میڈرڈ تک کبھی نہ پہنچ سکا، اگر یہ فقرہ یوں ہوتا" مگر یہ طمطراق کا مراسلہ جو عالمگیر امن و صلح کا سفارشی تھا، میڈرڈ تک کبھی نہ پہنچ سکا، تو مفہوم واضح ہو جاتا، ص ۱۳۱ پر مور یہ شہنشاہوں کو موریا شہنشاہوں لکھا ہے، جو کاتب کی کاردستانی معلوم ہوتی ہے، ص ۱۳۲ پر علم جغرافیہ کی بنیادی معلومات سے صرف نظر کرتے ہوئے بندھیاچل مشرقی گھاٹ کو بندھیاچل مغربی گھاٹ تحریر کیا ہے جو محل تنظر ہے، نیز طاقتور متحدہ قدم کی بجائے طاقتور متحدہ قوم ہونا چاہئے، ص ۱۳۸ پر تمام اعلیٰ اور ادنے ..... "کی بجائے تمام اعلیٰ اور ادنیٰ ....' صحیح ہے، ص ۱۴۱ پر شیخ فرید بخاری کی فیاضی کے سلسلے میں ایک فقرہ یوں سپرد قلم ہوا ہے، .... اُس نے محتاجی یا افلاس دیکھا ہو اور مدد نہ دی ہو، یہاں محتاجی یا افلاس کی بجائے محتاج اور مفلس' ہونا چاہئے، اسی صفحہ پر کابل کے غیور بیگ کے لڑکے زماں بیگ کو کابل کے غیاث بیگ کا لڑکا زمانہ بیگ' بتلایا ہے، اور ص ۱۴۲ پر بافراد فیاضی' کی بجائے با فراط فیاضی' لکھنا چاہئے تھا، ص ۱۴۶ پر خسرو کے فرار کے سلسلے میں جو تاریخ دی گئی ہے، اُسے ۱۶ اپریل کے بجائے ۶ اپریل ہونا چاہئے، ص ۱۴۹ پر ۸ اپریل کے بعد سنہ ۱۶۰۶ء کتابت سے رہ گیا ہے، ص ۱۴۷ پر نرملہ کی سرائے اور ص ۱۵۰ پر بھیرووالی' کی بجائے علی الترتیب' نریلہ کی سرائے' اور بھیروں والی ہونا چاہئے،

ص ۱۵۳ پر موصوف نے ایک نہایت ہی مضحکہ خیز فقرہ' باغیوں کو وحشیانہ سزائیں' عنوان کے تحت سپرد قلم کیا ہے، "حسین بیگ کو بیل کی تازہ کھال میں سی دیا گیا، اور

عبدالرحیم کو گدھے کی کھال میں جس کے سینگ اوپر کو نکلے ہوئے تھے، فقرے کی ساخت سے صاف معلوم ہوتا ہے یہاں سینگ کا تعلق گدھے سے ہے، ممکن ہے، عہد جہانگیری میں گدھے کے سر پر سینگ ہوتے ہوں، ص ۱۵۴ پر گرو ارجن کا سنہ پیدائش ۱۵۶۵ء اور اُسے جانشین نامزد کرنے کا سنہ ۱۵۵۱ء تحریر کیا ہے، یعنی گرو ارجن اپنی پیدائش سے چودہ سال قبل ہی جانشین بنائے جا چکے تھے، سکھ اسے اپنے گرو رام داس کا چمتکار تسلیم کرتے ہوں گے، در اصل گرو ارجن کا سنہ پیدائش ۱۵۶۳ء اور انھیں جانشین نامزد کرنے کا سنہ ۱۵۸۱ء ہے، اسی ص پر گرو ارجن کو چوتھے گرو رام داس کا چوتھا لڑکا بتلایا ہے، جب کہ وہ سب سے چھوٹا لڑکا (The youngest son) تھا، ص ۱۵۴ پر ہی ترن تارن کا قصبہ شہر آباد کیا، فقرہ کے بعد established the Temple.....

of god (Harmandar)' ibid p. 128

کا ترجمہ سہواً چھوٹ گیا ہے، ص ۱۵۵ پر ادی گرنتھ تیار کی، فقرہ میں آدی گرنتھ (आदि ग्रंथ) مونث نہیں ہے، مذکر ہے،

ص ۱۶۴ پر ۱۵۱۰ء کی بجائے ۱۵۹۰ء اور شہرت اور ساری دنیا میں وقار حاصل کیا، کی بجائے شہرت اور ساری مشرقی دنیا میں وقار حاصل کیا، نیز یہ وہ فرمانروا تھا جس نے جہانگیر کو اپنی ساری مدت میں نباہنا پڑا، کی بجائے یہ وہ فرمانروا تھا جس سے جہانگیر کو اپنی ساری مدت نباہ کرنا پڑا، ہونا چاہئے، ص ۱۶۳ پر شاہ عباس ۱۵۸۷ء تا ۱۶۳۶ء کی بجائے شاہ عباس ۱۵۸۷ء تا ۱۶۲۹ء لکھنا چاہئے، ص ۱۶۵ پر ..... اس کا کماندار مرزا جانی بیگ ترخان کا مرزا غازی تھا، اسے یوں لکھ کر اس کا کماندار مرزا غازی ابن مرزا جانی بیگ ترخان تھا، آسان کیا جا سکتا تھا، ص ۱۶۶ پر کابل میں

داخلہ کے عنوان کے تحت ۳۰ رجون کی بجائے ۳ رجون، اور حاشیہ نمبر ۵ میں بختیار خاں
کی بجائے بختاور خاں ہونا چاہئے، ص ۱۶۶ کے حاشیہ نمبر ۹ میں پہلا ہی فقرہ نقل ہے جو اس
طرح ہے، "میر شریف آملی اپنے زمانے میں ایک بڑا بیباک اور مشہور آزاد خیال اور ایک ملک
سے دوسرے ملک میں فرار ہوتا رہا تھا" ص ۱۶۸ پر انھیں امتیاز کے لئے ایک ایک بلا دیا
گیا، "فقرہ میں 'بلا' کی بجائے 'بلہ' ہونا چاہئے، اسی صفحہ پر مرزا محمد بیگ ازبیگ کو مرزا
محمد بیگ ازبک، بنا دیا ہے، ازبک آج کل احمق کو بھی کہتے ہیں،

ص ۱۷۴ پر ڈو (DOW) کی ہسٹری آف اندوستان کو وارڈر کی ہسٹری
آف ہندوستان لکھا ہے، صفحہ ۱۷۴ پر ہی ایک فقرہ یوں لکھا ہوا ہے، "تین گھنٹے وہ اس
کے منتظر رہے، کہ شاید کسی زمیند روندہ سے کوئی مدد مل جائے یہاں تین گھنٹے کی بجائے
کچھ گھنٹے (Somehours) اور زمیند روندہ کی بجائے راہرو (Passer-by)
ہونا چاہئے، لفظ زمیند روندہ ناقابلِ فہم ہے، اگر اسے اسم فاعل قیاسی ہی بنانا تھا، تو راہ روندہ
ہو سکتا تھا، ص ۱۷۱ کے حاشیہ نمبر ۱۵ میں شہزادوں کی تشخیص کے سلسلے میں ایک فقرہ قابل توجہ
ہے "سترہویں صدی میں شہزادوں کی بالکل شکل نہ تھی" سترہویں صدی ہی کیا، ہر زمانہ
میں شہزادے عیش و عشرت کی زندگی ہی بسر کرتے رہے ہیں، شکل کیا معنی اصل میں لفظ تشخیص
نہ لکھنے کے سبب فقرہ سے کچھ اور مفہوم واضح ہو رہا ہے، ص ۱۷۶ کے حاشیہ نمبر ۱ میں تصنیف
کی آگرہ کے بجائے لطیف کی آگرہ، اور ص ۱۷۷ کے آخر میں ۱۵۹۱ء کی بجائے ۱۵۹۴ء ہونا
چاہئے، ص ۱۸۰ پر ایسے گندے جرم کا خیال نہ کرتا، کی بجائے ایسے گندے جرم کا اقبال نہ کرتا
اور ص ۱۸۱ پر اندرون ملک کی بجائے اندرونِ ملک، لکھنا چاہئے، ص ۱۸۱ پر ہی سر طامس ہربرٹ
پیٹر ہی سال بعد آئے، کو فی الواقع یوں لکھنا چاہئے تھا "سر طامس ہربرٹ عہد جہانگیر

کے تقریباً اختتام پر اور پیٹر منڈی چند سال بعد ہندوستان آیا، اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۲
میں میرہ (واج ٹو ایسٹ انڈیا ص ۴۰۴) کی بجائے ٹیری (ویاج Voyage
ٹو ایسٹ انڈیا ص ۴۰۴) نیز اسی حاشیہ میں بادشاہی کی بجائے بادشاہ سے شادی اور ۱۶۲۳-۲۴
سے پہلے ڈیلا ویلی ہونا چاہئے،

ص ۱۸۲ پر حاشیہ گذشتہ سے پیوستہ میں (سفر ڈیلا ویلی ....) کی بجائے (سفرنامہ پی
ڈیلا ویلی ....) بازاری افسانہ کی بجائے بازاری افسانہ' باندیوں کی طرح اس کے شایانِ شان
نہیں ہے، کی بجائے باندیوں کی طرح رہنا اس کے شایانِ شان نہیں ہے، نیز .... حلال خور
سے جاوے کی بجائے حلال خور سے بیاہ دیا جاوے ہونا چاہئے، اسی حاشیہ میں ایک بے معنی
طویل فقرہ یوں لکھا ہوا ہے ..... تاہم بادشاہ کے دل میں پھر محبت نے زور کیا، اور بعض لوگ
کہتے ہیں جادو ٹونے سے (جس کا مجھے یقین نہیں ہے) اور عورت کا حسن جو روز افزوں
تھا، تو بالآخر بادشاہ نے اسے بطور ملکہ اور دوسری ملکاؤں سے بالاتر قبول کرنا منظور
کرلیا، اسی حاشیہ کا ایک دوسرا فقرہ اس طرح ہے، ...... اس لئے اُسے ہر جگہ نشت
کرلیا جائے تاکہ اُسے گندی بلیں، نیز ہسٹری ۱۶۲۹ء کی بجائے پیٹر منڈی ۱۶۲۹-۳۴ء
فرانکوے برنیر کی بجائے فرانکوے برنیر اور غیر معمولی کا ذکر کرتا ہے، کی بجائے غیر معمولی
اثر کا ذکر کرتا ہے ہونا چاہئے، یہ پورا حاشیہ نمبر ۱۸۲ اغلاط و نقائص سے پُر ہے،

ص ۱۸۴ پر حاشیہ نمبر ۲ میں بھلودی کا راجہ بانہ جسے ایل بی سی نودی نے بارڈک اینڈ ہسٹاریکل
کی بجائے بھلودی کا راجہ بانہ کھیات (Khayata) جسے ایل پی ٹیسی ٹوری نے
بارڈک اینڈ ہسٹاریکل لکھنا چاہئے تھا، ص ۱۸۵ کے حاشیہ نمبر ۹ میں لطیف کی ہسٹری آف پنجاب
کی بجائے لطیف کی ہسٹری آف پنجاب اور حاشیہ نمبر ۱۰ میں سوریا مل نے اپنی بھنشا بھاسکر

میں اور سجاد الرحمٰن ہمنہ نے اس پر کرمی سلیم کی مہرالنسا کے محبت کے قصہ کو اور زیادہ رنگین
باتیں ملا کر پیش کیا ہے، کی بجائے [illegible] ل نے اپنی بنش بھاسکر میں اور تجارام ہمتہ نے اپنی
پراکرمی ہاڈوارادی میں سلیم مہرالنساء کے قصہ کو اور زیادہ رنگین باتیں ملا کر پیش کیا ہے، ہونا چاہئے
تھا، ص ۱۰۶ کی پہلی لائن میں لفظ جمالیاتی کے بعد ذوق کتابت سے رہ گیا ہے، ص ۱۰۹ پر
اس کی دو دامی پنج تولیہ کناری کی بجائے اس کی دو دامی اور پنج تولیہ، باڑھ کناری
ہونا چاہئے تھا اسی صفحہ کے دوسرے پیراگراف کے پہلے فقرہ کی فصاحت ملاحظہ فرمائیے، "اس کا
دل فیاضانہ تھا اور اتنا معاشرت پسند تھا، فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا، اس کا مزاج جتنا
فیاض تھا، اتنا ہی متمدن بھی، اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱۲ میں ساٹھ سال کی عمر میں ہوا سے
آگے جو لکھا ہے، اور ہونا چاہئے تھا، اسی حاشیہ کے آخری فقرہ "...... اور فری سال سے
۷۶ برس کی ایک بعد انگریزی کے حسب ذیل فقرہ "She composed ver-
ses under the nom de plume of Makhfi p158
کا ترجمہ وہ مخفی کے تخلص سے شعر کہتی تھی، نہیں دیا گیا، حیرت یہ ہے کہ اس فقرہ کو
ص ۱۰۵ کے حاشیہ نمبر ۱۴ میں نورجہاں سے منسوب کر دیا گیا ہے، جبکہ یہ فقرہ سلطانہ
سلیمہ بیگم کے بارہ میں ہے، حاشیہ نمبر ۱۲ میں ہی ۲۳ جنوری ۱۵۳۹ء کی بجائے ۲۳ فروری
۱۵۳۹ء ہونا چاہئے، ص ۱۰۶ کے ہی حاشیہ نمبر ۱۳ میں غیر ملکی کپڑے کی کاٹھی دیکھا جو
چمکدار پھولوں اور شوخ رنگ درختوں سے کڑھی ہوئی تھی، بادشاہ نے خانساماں سے
درخواست کیا ...... کی بجائے غیر ملکی کپڑے کی سنہری جھول کا ہاتھی دیکھا جو چمکدار
پھولوں اور شوخ رنگ پتیوں سے کڑھی ہوئی تھی، بادشاہ نے خانساماں سے دریافت
کیا ..... ہونا چاہئے تھا، ص ۱۹۰ پر اور پھر آصف خاں ہو گیا، کی بجائے اور پھر تین

سال بعد آصف خاں ہو گیا، نیز اسی صفحہ پہ ارجمند بانو بیگم کی شادی شہزادہ خرم سے
ہو گئی جو اب دس سال کا ہو گیا تھا، کی بجائے ...... جو اب بیس سال کا ہو گیا تھا،
ہونا چاہئے،

ص ۱۹۱ پر رقیہ سلطان بیگم کو صرف 'رقیہ بیگم' تحریر کیا ہے، اسی صفحہ پر شہزادہ
خرم کے استادوں کے سلسلے میں یوں لکھا ہے: مذہبی اور غیر علوم کے استاد قاسم بیگ
تبریزی اور ایک شیخ مبارک کے سچے جانشین ابو الخیر تھے" گویا شیخ مبارک نامی مختلف
اشخاص تھے، اُن میں سے ایک کے سچے جانشین ([illegible]) ابو الخیر بھی
تھے، دراصل فقرہ یوں ہونا چاہئے" مذہبی اور غیر مذہبی علوم کے استاد قاسم بیگ تبریزی
اور شیخ مبارک کے ایک سچے جانشین ابو الخیر تھے، اسی ابو الخیر کو ص ۲، پر فاضل
مترجم اکبر کا بھائی بتلا چکے ہیں، ص ۱۹۳ پر حصار فیروزہ 'کو حصار خیزہ' اور ص ۱۹۴ پر
.... ولیعہد سلطنت سے اتحاد نمایاں ہو گیا 'کو' ولیعہد سلطنت سے اختلاف نمایاں
ہو گیا" لکھا ہے، اسی ص ۱۹۴ پر چند ہی سال کے اندر خرم بیس ہزار ذات اور بیس ہزار
سوار کے لئے بے نظیر منصب پہ پہنچ گیا، کی بجائے چند ہی سال کے اندر خرم تیس ہزار ذات
اور بیس ہزار سوار کے بے نظیر منصب پر پہنچ گیا، ہونا چاہئے، ص ۱۹۶ پر بقیہ حاشیہ میں
پیٹر منڈی کا بیان ہے، جس نے ۱۶۲۹ء سے ۱۶۳۴ء تک ہندوستان کا دورہ کیا (سفر نامہ
جلد دوم ص ۱۰۶) کی بجائے پیٹر منڈی کا بیان ہے، جس نے ۱۶۲۹ء سے ۱۶۳۴ء تک
ہندوستان) کا دورہ کیا، (سفر نامہ جلد دوم ص ۲۰۶) لکھنا چاہئے، اسی حاشیہ میں دو
جگہ 'پی ڈیلا دیں' اور ایک جگہ 'دربار' کتابت سے رہ گیا ہے، اور بریز ص ۱۵ کی بجائے بریز
ص ۵ ہونا چاہئے، نیز نصاب جلد، کی بجائے سفر نامہ جلد اول، ہونا چاہئے،

ص ۱۹۷ پر سنہ ۱۶۲۲ء کو سنہ ۱۶۲۳ء لکھا ہے، اسی صفحہ پر تحکم بنید کے بعد ملکہ کتابت سے رہ
گیا ہے، ص ۱۹۷ پر ہی "جہانگیر اس کی دلیل ہوا" کی بجائے "جہانگیر اس کی دلیل سے متاثر ہوا" نیز
"چار ہزار ذات اور تین ہزار سوار" کی بجائے "چار ہزار ذات اور تین ہزار پانچسو سوار" ہونا چاہیئے،
ص ۱۹۹ کے حاشیہ نمبر ۲۶ میں "... بڑے ممتاز اور معزز افراد شامل ہیں" کی بجائے
"... بڑے ممتاز اور نہایت معزز (Most honourable) افراد شامل ہیں" ہونا
"کہیں وہ نہ جائے" کے بجائے "کہیں وہ بھاگ نہ جائے" لکھنا چاہیئے، ص ۲۰۲ پر "...
اور طرح کی افواہیں ..." کی بجائے "اور طرح طرح کی افواہیں ..." نیز ص ۲۰۳ پر
سنہ ۱۶۰۵-۱۶۲۳ء کو سنہ ۱۶۰۵-۱۶۲۲ء لکھنا چاہیئے، ص ۲۰۵ پر "اور جنہیں فوراً دیا گیا" کی بجائے
"اور جنہیں فوراً دبا دیا گیا" ہونا چاہیئے، ص ۲۰۶ پر "مگر سنہ ۱۶۱۱ء میں سورت کے قریب پرتگالیو
نے سارے ہی جہازوں پر قبضہ کر لیا" یہ انگریزی کے حسب ذیل فقرہ کا ترجمہ ہے:-

"in 1613, however the Portuguese
seized four imperial ships"

ibid. p. 175

مگر یہ واقعہ سنہ ۱۶۱۳ء کا ہے، نیز ترجمہ بھی محل نظر ہے، اسی صفحہ پر "پورتگالی" اور "پورتگالیوں" کا
کا املا "پرتگالی" اور "پرتگالیوں" ہونا چاہیئے، ص ۲۱۰ کے حاشیہ نمبر ۲۰ میں راجرس وبیورج جلد اول
اور ص ۲۰۹ کی بجائے ... ص ۲۹ اور "سنہ ۱۶۱۳ء تک برابر بنگال کا گورنر" کی بجائے
"... بنگال کا گورنر رہا" ہونا چاہیئے، ص ۲۲۷ پر دیگر ماتحت افسران کے زیر عنوان ایک
فقرہ یوں ہے، "راجہ بہارامل کے لڑکے اور ایک پانچ ہزار منصب کے اعلیٰ امیر جگنا تھ
کو اپنی فوج میں شامل کرنے کا حکم دیا" گویا راجہ بہارامل کا "اور" کا (Delete)

جگنا تھ، راجہ بہارامل والیٔ انبیر کا راجکمار نہ ہو کر کوئی دیگر شخص تھا جب کہ فی الواقع
فقرہ یوں ہونا چاہیئے: "تھا، راجہ بہارامل کے لڑکے جگنا تھ اور پانچ ہزار منصب کے ایک اور
اعلیٰ امیر کو اپنی فوج میں شامل کرنے کا حکم دیا" اسی صفحہ پر "اطاعت شعاری" کو "اشاعت
شعاری" لکھا ہے، ص ۲۲۸ پر حاشیہ نمبر ۱۶-۱۵ "... رانا کے چچا بہادر کھیا تا کو حاصل ہوا
جو ایک بڑے قبیلہ کا جد اعلیٰ ہے، جو اسی کے نام پر کھوات کہلاتا ہے" رانا کا بہادر چچا کانہا تھا
اور یہ جس قبیلے کا مورث اعلیٰ تھا، اس کے افراد آج تک کانادت کہلاتے ہیں، نہ کہ کھوات
ص ۲۳۱ و ۲۳۲ کے حاشیہ نمبر ۲۶-۲۵ میں راجپوت سرداروں کے ناموں کو اکثر و بیشتر
غلط لکھا ہے،

مشہور تاریخی کتاب "ہر نبود" کا املا تقریباً ہر جگہ "ہبر نبود" لکھا ہے، ص ۲۳۸ پر
حاشیہ نمبر ۴۵ کا اندراج غلط ہو گیا ہے، حاشیہ نمبر ۴۵ یوں ہونا چاہیئے تھا، جہانگیر راجرس
اینڈ بیورج جلد اول ص ۳-۷۲-۲۵۹-، اقبال نامہ ص ۳۰، خافی خاں جلد اول
(ص ۲۷۸-۸۰)، گلیڈون، ص ۳۰، ص ۲۴۳ پر ولیم فنچ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسم
مبارک سے قبل جو گستاخانہ لفظ ملامتی لکھا ہے، اس کے آگے قوسین میں یہ تردیدی کلمات کا
ہونا انتہائی ضروری تھا، گو نقلِ کفر کفر نہ باشد جناب رحم علی الہاشمی صاحب کو ہاشمی الاصل
ہونے کے سبب یہ تردیدی نوٹ لکھنا اور بھی لازمی تھا،

ص ۲۵۱ پر ۱۳۱۷ء کی بجائے سنہ ۱۳۴۷ء اور (سنہ ۱۴۸۹-۱۶۰۹ء) کی بجائے (سنہ ۱۴۹۲-۱۶۰۹ء)
نیز (سنہ ۱۴۸۹-۱۶۵۶ء) کی بجائے (سنہ ۱۴۸۹-۱۶۸۶ء) ہونا چاہیئے، ص ۲۵۳ پر مغلوں کی ایک فتح،
کے زیر عنوان حسب ذیل دو انگریزی فقروں کا ترجمہ نہیں دیا گیا،

The imcapable sultan Murad had-

To be superseded' p. 220, ibid

'Ahmednagar had fallen, but the

Kingdom could not be

annexed" ibid. p. 220

ص ۲۶۴ پر دوگنی رشوت کی بجائے دکنی رشوت (Deccan Gold) اور
ص ۳۰۲ پر کھمبیات کی بجائے کھمبائت ہونا چاہئے، ص ۳۱۷ پر ایک فقرہ نہایت پر لطف
ہے جو اس طرح ہے، "مگر یہ اگر سچ بھی ہے، تو اس سے کوئی مفید مطلب بات ثابت نہیں
ہوتی،" اس فقرہ کو اگر یوں لکھ دیا جاتا، "اگرچہ یہ واقعہ سچ بھی ہو تو اس سے کوئی مفید مطلب بات ثابت
نہیں ہوتی" تو اس کی فصاحت میں کونسا فرق واقع ہو جاتا، ص ۳۱۹ پر دسمبر ۱۶۳۰ء کی بجائے
دسمبر ۱۶۲۲ء اور ص ۳۲۰ پر ۲۱-۱۶۲۰ء کی بجائے ۲۲-۱۶۲۱ء ہونا چاہئے، ص ۳۲۰ پر
اعتماد الدولہ کے انتقال کے سلسلے میں ایک فقرہ یوں لکھا ہوا ہے، "اپنے عہد کی ایک سب سے
زیادہ نمایاں ہستیوں میں سے ایک کا اس طرح خاتمہ ہو گیا،" بجائے اس کے فقرہ کو یوں
لکھا جاتا تو بہتر تھا، "اپنے عہد کی نمایاں ترین ہستیوں میں سے ایک کا اس طرح خاتمہ ہو گیا"
ص ۳۲۲ پر منصب بیس ہزار کی بجائے، منصب تیس ہزار اور ص ۳۲۳ کے آخر میں "اکبر سے
حسن ابدال ۸۰ میل تھا،" کی بجائے، "اکبر پور سے حسن ابدال ۸۰ میل تھا،" ہونا چاہئے،
دیگر charts بھی بالعموم صحت کے ساتھ نہیں دیئے گئے،

ص ۳۲۷ پر پہلا ہی فقرہ محل نظر ہے، "جیسے ہی دکن میں جہانگیر اور شاہجہاں کا پیچھا
ہوا،" معلوم نہیں جہانگیر اور شاہجہاں کا دکن میں تعاقب کب اور کس نے کیا، فاضل مترجم نے
(Turned Their backs) کا ترجمہ پیچھا ہوا کیا ہے جبکہ
فقرہ یوں ہونا چاہئے تھا، "جیسے ہی دکن سے جہانگیر اور شاہجہاں واپس (پیٹھ پھیری) ہوئے"

اسی صفحہ پر.... "جو بزور قوت اس پر عائد کیا گیا تھا،" کی بجائے "جو بزور قوت دو سال پہلے اس
پر عائد کیا گیا تھا،" ہونا چاہئے، ص ۳۲۹ پر یہ فقرہ غور طلب ہے، "کہ اس کے دو رقیبوں
میں سے ایک کا دوسرے کے ساتھ خاتمہ ہو جائے،" عبارت سے صاف طور پر مترشح
ہے کہ دونوں (خسرو اور خرم) کا خاتمہ بیک وقت ہو جائے، درحقیقت فقرہ یوں
ہونا چاہئے تھا، "کہ اس کے (نور جہاں) دو رقیبوں میں سے ایک کا دوسرے کے ہاتھ
سے خاتمہ ہو جائے،" اس فقرہ کے بعد انگریزی کے حسب ذیل فقرہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا،

The gravity of the Deccan -

situation at length decided Jahangir

to comply with Shah Jahan's demand"

ibid pp. 283. 84

۲۱-۱۶۲۰ء میں شاہجہاں دکن کی مہم پر جانے کے لئے اس شرط پر آمادہ ہوا تھا
کہ خسرو کو (بطور یرغمال) اس کے ہمراہ کر دیا جائے، اس پس منظر میں مندرجہ بالا انگریزی
فقرہ کا ترجمہ دینا انتہائی ضروری تھا، انگریزی فقروں کے ساتھ ایسا اغماض جا بجا برتا
گیا ہے، اسی صفحہ پر.... "اور عوام پر کتنا خوف طاری ہوا ہوگا،" کی بجائے.... "اور امرا
اور عوام پر کتنا خوف طاری ہوا ہوگا،" ہونا چاہئے، نیز "آفواہیں" کی بجائے "افواہیں" لکھنا
چاہئے، ص ۳۲۹-۳۰ پر.... "شہر کو مع اُن خوبصورت عمارتوں کے جو گذشتہ عمارتوں کے
جو گذشتہ بیس سال میں تعمیر ہوئی تھیں،" کی بجائے یوں لکھنا چاہئے تھا، "شہر کو مع اُن
خوبصورت عمارتوں کے جو گذشتہ بیس سال میں تعمیر ہوئی تھیں،" معلوم ہوتا ہے، پروف
ریڈنگ کی زحمت بالکل نہیں فرمائی گئی،

ص ۳۳۹ پر شاہ عباس نے مغل کماندار کو رشوت دینے کی کوشش کی، یہاں مغل
کماندار مرزا اغازی بیگ کا نام نہیں لکھا، اسی طرح ص ۳۴۲ پر مغل سفیر خان عالم کا
نام بھی نہیں لکھا ہے، اور صفحہ ۳۴۰ پر یادگار (yadgar) کو یادگیر لکھا ہے،
ص ۳۴۴ پر (بقیہ حاشیہ ص ۳۴۳) دبنجاروں یا کھیلوں کو دیکھا، پتہ نہیں کھیلوں
سے فاضل مترجم کی کیا مراد ہے؟ اصل میں تو یہاں قافلوں ہونا چاہیے، اسی صفحہ پر اور
اسی حاشیہ میں مترجم موصوف یوں لکھتے ہیں، "صبح ہمیں بنجاروں کا ایک ٹنڈا ملا،
بنجاروں کا ٹانڈا تو مشہور ہے مگر ٹنڈا پہلی دفعہ نظر سے گذرا ہے، ص ۳۴۵ پر دونوں
فوجوں میں لڑائی کو زیادہ دیر ہوئی تھی، کی بجائے، دونوں فوجوں میں لڑائی کو
زیادہ دیر نہ ہوئی تھی، اور ص ۳۵۵ کے حاشیہ ۳ میں نورالدین علی کی بجائے نورالدین
قلی ہونا چاہیے، ص ۳۵۶ کے حاشیہ ۲ میں ہر ایک منصبدار کے ذات وسوار منصب
میں اعداد وشمار کا اندراج غلط کیا گیا ہے، یعنی سید ہبوا کو دو ہزار ذات اور ایک ہزار
سوار کے منصب پر ترقی دی گئی، مکرم خاں کو پانچہزار و دو ہزار پر، خواجہ قاسم کو ایکہزار
چار سو پر..... کی بجائے سید ہبوا کو دو ہزار ذات اور ایک ہزار پانچ سو سوار کے منصب
پر ترقی دی گئی، مکرم خاں کو تین ہزار و دو ہزار پر، خواجہ قاسم کو ایک ہزار چار سو پر.....،
نیز اسی حاشیہ میں امان اللہ کو تین ہزار ذات وسوار پر ترقی دی گئی تھی، کی بجائے امان اللہ
کو تین ہزار ذات وسوار اور پھر چار ہزار ذات وسوار پر ترقی دی گئی تھی' ہونا چاہیے'
ص ۳۵۶ پر عنوان پرویز کی آمد کے تحت پہلا فقرہ یوں ہے، "۱۱ کو شہزادہ پرویز دریائے
ہنڈون پر پہنچ گیا، بظاہر فقرہ صحیح ہے، مگر آپ اس کا انگریزی کے حسب ذیل فقرہ
سے مقابلہ کیجیے:-

"On the 11th at Hindaun arrived prince parvez" p. 309

تو معلوم ہوگا کہ فاضل مترجم کی نوک قلم نے ایک بڑے قصبہ (ہنڈون) کو دریا بنا دیا،
(ہنڈون ضلع سوائی مادھو پور میں دہلی بمبئی ریلوے لائن پر ایک اسٹیشن ہے، جو سلطنت
اور مغل عہد میں بیانہ و ہنڈون کے نام سے ایک پرگنہ رہا تھا) اسی صفحہ پر اعتبار خاں
کے منصب کو چھ ہزار ذات اور تین ہزار سوار کی بجائے، چھ ہزار ذات اور پانچہزار
سوار لکھنا چاہیے تھا،

ص ۳۵۹ پر ۱۶۱۲ء میں دکن روانہ ہوتے وقت ... کی بجائے ۱۶۲۲ء میں
دکن سے روانہ ہوتے وقت ....، نیز شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل کی ایک بھتیجی کے شوہر دیوان
صفی کے ساتھ کی بجائے شاہجہاں کی بیگم ممتاز محل کی ایک بہن کے شوہر دیوان صفی کے ساتھ
ہونا چاہیے، دیوان صفی شاہجہاں کا ہم زلف تھا، یعنی ممتاز محل کی ایک بہن کا شوہر، بھتیجی
کا شوہر میر جمال الدین تھا، ص ۳۶۲ پر مناسب اخراجات کو مناسب عزازات، اور
ص ۳۷۷ پر مفرور باقی کو مفرور باغی لکھنا چاہیے تھا، ص ۳۷۶ پر ساری گذرگاہیں ان
کے قبضہ میں تھیں، فقرہ کے بعد حسب ذیل انگریزی فقرہ کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا:-

Just as Bairam Beg had in 1623 held those on the Narbada (P. 326)

ص ۳۸۳ پر احمد نگر نیز بیجاپور کا محاصرہ عنوان کو دو ٹکڑوں میں علیحدہ علیحدہ لکھا ہے... ص ۳۸۴ پر ہانسوید محاصرہ کے
تحت ایک فقرہ اس طرح لکھا ہے... لال قلعہ میں خیمہ زن ہو کر قلعہ کی تسخیر کا منصوبہ بنایا، پتہ نہیں برہان پور
کے آس پاس لال قلعہ کس نے اور کب تعمیر کرایا؟ دراصل یہاں لال قلعہ کی بجائے

لال باغ' ہونا چاہیے، ہم اسے تو تصحیف کاتب نہیں کہہ سکتے

ص ۴۱۴ پر ۳۰ رمضان ۱۰۳۵ھ کی بجائے ۲۷ رمضان ۱۰۳۵ھ لکھنا چاہیے،
اسی صفحہ پر جو پورے طور دفاع کے لئے تیار تھے، فقرہ کے بعد انگریزی کے مندرجۂ ذیل
فقرہ کا ترجمہ نہیں کیا گیا ۔۔

The Garrisom Comprised Between
3,000 and 4,000 horseand 10,000
infantry' (PP.362 Third Edition.)

ص ۴۱۴ پر ہی قلعہ ٹھٹھ کے سلسلہ میں نوٹ نمبر ۶ نہیں دیا گیا، ص ۴۱۷ پر ایک
فقرہ ملاحظہ فرمائیے، کچھ دور تک تو حسب وعدہ تحفہ کا راستہ اختیار کیا، قارئین ہمارے
ملک کی اٹلس (Atlas) میں تحفہ کا جائے وقوع دیکھنے کی خود ہی زحمت فرمائیں،
کاتب نے ٹھٹھ' کو تحفہ' بنا دیا، گو پوری کتاب بجائے خود تحفہ ہے،

ص ۴۱۹ پر شہزادہ پرویز کے انتقال کا سنہ خلافِ واقعہ ۱۶۳۶ء دیا ہے،
۱۶۲۶ء ہونا چاہیے، ص ۴۲۴ پر بایسنغر کا املا بایسانغر تحریر کیا ہے، ص ۴۲۵
کے تینوں حاشیوں میں چند نقائص رہ گئے ہیں، ص ۴۲۸ پر تاریخ دسیسہ کاریوں اور سیاحوں
کی جعلسازیوں...." کی بجائے تاریخی دسیسہ کاریوں اور سیاحوں کی حکایتوں' ہونا
چاہیے، اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱ میں اچانک ایک سانس اور دو میری آنکھ کی بجائے "اچانک ایک سانس اور دو کہار میرے آگے آگئے"،
اسی حاشیہ میں پیروں کے پیر کی نس کاٹ کر' بجائے، کہاروں کے پاؤں کی نس
کاٹ کر ہونا چاہیے، ص ۴۲۹ کے حاشیہ نمبر ۲ میں محروم بھائی کو مرحوم بھائی لکھنا چاہیے
تھا، ص ۴۳۰ پر بقیہ حاشیہ کے آخر میں جلد اول صفحات ۱۵۸ تا ۱۵۹ سے پہلے اسٹوریہ

ڈومو گرا' ہونا چاہیے،

ص ۴۳۱ کے حاشیہ نمبر ۲ میں دربار میں شیخ احمد سرہندیؒ کی طلبی کا سنہ خلافِ
واقعہ ۱۶۲۹ء دیا ہے، جبکہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا زمانۂ حیات (۱۵۶۳ء۔۱۶۲۴ء)
ہے، در اصل دربار میں آپ کی طلبی اور اسیری کا واقعہ ۱۶۱۹ء میں ہوا، ص ۴۳۵ پر تین
سال پہلے اس نے اور انسانی ہمدردی کا فرمان کی بجائے تین سال پہلے اس نے انسانی
ہمدردی کا ایک اور فرمان ..." لکھنا چاہیے اور اسی صفحہ پر قبیح رسم جو بگڑ کے ہو کر دربار بنو امیہ کے دربار میں آئی تھی
کی بجائے قبیح رسم جو بگڑے ہوئے بازنطینی دربار سے بنو امیہ کے دربار میں آئی تھی، نیز اسی صفحہ کے حاشیہ نمبر ۱ میں اورنگزیب
نے بھی کرنے کی ممانعت کی بجائے، اورنگزیب نے بھی نامزد کرنے کی ممانعت کر دی ہونا
چاہیے، ص ۴۴۷ پر حکومت کے مکتوب بنام سکریٹری صدر بورڈ آف ریونیو مورخہ
۱۴ اگست ۱۸۴۶ء میں درج ہیں، کی بجائے، حکومت کے مکتوب بنام قائم مقام
سکریٹری صدر بورڈ آف ریونیو نمبر ۲۳۳۶ آف ۱۸۴۶ء مورخہ ۱۴ اگست ۱۸۴۶ء
میں درج ہیں، لکھنا چاہیے تھا، ص ۴۵۴ پر مآثر رحیمی کو دو جگہ ناثر رحیمی لکھا ہے، جو
کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے، صفحہ ۴۵۵ پر ہی ایک مہمل فقرہ اس طرح درج ہے کہ شاعروں
کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تحقیقات سے کثرت نمونے جو خانِ خاناں کی سرپرستی میں
فروغ پا رہے تھے، کی بجائے شاعروں کے حالاتِ زندگی اور اُن کی تخلیقات کے
بکثرت نمونے دیئے ہیں، جو خانخاناں کی سرپرستی میں فروغ پا رہے تھے۔" اور ص ۴۴۶
پر... معتمد خاں کے بیانات پر مبنی ہے، کی بجائے .... معتمد خاں اور کامگار کے
بیانات پر مبنی ہے، نیز ص ۴۷۴ پر گرانٹ ڈف' اور میجر بارڈن کی بجائے، گرانٹ
ڈف' اور میجر اے گارڈن' ہونا چاہیے، ص ۴۹۴ پر .... بہادروں کے نا بیان

کیے گئے ہیں، کی بجائے .... بہادروں کے کارنامے بیان کیے گئے ہیں،" اور ص ۵۰ ہم پر بندیلیوں کی بجائے بندیلوں،" اور ص ہم ۵ ہم پر سولینین میں پیدا ہوا،" اور جولائی ۱۵۹۰ء میں .... کی بجائے لولیٹن (Lowleyton) میں پیدا ہوا،" اور ۱۵۹۳ء میں .... لکھنا چاہیے، ص ۵۲-۵۵ ہم پر سرطامس رو کے بارے میں ایک فقرہ یوں ملتا ہے، نومبر ۱۶۱۶ء میں وہ بادشاہ کے ساتھ مانڈو گیا، اور وہاں ۱۶۱۸ء کے آخر میں احمد آباد "معلوم ہوا کہ سرطامس رو تقریباً دو سو سال تک بقید حیات رہا، اصل میں فقرہ کا آخری حصہ یوں ہونا چاہیے تھا،" اور وہاں سے ۱۶۱۷ء کے آخر میں احمد آباد، سرطامس رو کے بارے میں ہی پیراگراف کے آخر میں انگریزی کے اس فقرہ

"Reached England in 1619"

کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا، ص ۵۵ ہم پر ہی ایک دوسرے انگریز سیاح ایڈورڈ ٹیری کے ڈاؤنس پہونچنے کا سنہ خلاف واقعہ ۱۹۱۹ء تحریر کیا ہے، جبکہ فی الواقع ۱۶۱۹ء ہونا چاہیے، ص ۵۶ ہم پر سیاح پیٹرو ڈیلا ویل کے بارے میں اس طرح لکھا ہے،" اور ۱۶۱۶ء میں ایشیائے کوچک اور مصر کا ایران ہوتے ہوئے سفر کیا" یہ فقرہ یوں ہونا چاہیے،" اور ۱۶۱۶ء میں ایشیائے کوچک ہوتے ہوئے مصر کا اور ایران ہوتے ہوئے فلسطین کا سفر کیا" ص ۶۱ ہم پر اورنگ زیب علیہ الرحمہ کا عہد خلاف واقعہ ۱۶۱۷ء ۱۶۵۸ء لکھا ہے، جبکہ ۱۶۵۸-۱۷۰۷ء ہونا چاہیے،

ص ۶۲-۶۳ ہم پر بھی چند اغلاط ہیں، جو درخور اعتنا نہیں، ص ۶۶ ہم پر کاتب نے سیشن جج اور مورخ جناب عبداللطیف مرحوم کو لطیفہ بنا دیا، ویسے پوری کتاب ہی غلطیوں کے لطیفوں سے پُر معلوم ہوتی ہے، اسی صفحہ پر نیشنز (Nations)

کو نیشنز، اور جے ٹالبائے وہیلر کو جے ٹالبوائے ویلر بنا دیا ہے، ص ۷۰ ہم پر تجا رام مینتہ کو مجا رام مینتہ، ص ۷۱ ہم پر جامی کی یوسف زلیخا کو حاجی کی یوسف زلیخا اور شیو سنگھ سینگر کو شیو دھ سین نگار لکھا ہے، بخوف طوالت دیگر صفحات کی بہت سی اغلاط کو عمداً نظر انداز کر دیا گیا ہے تاہم

کوتاہ نہ تواں کرد کہ ایں قصہ دراز ست

یہ ہے اس ترجمہ کا جائزہ جو جناب رحم علی الہاشمی صاحب کی محنت شاقہ کے بعد ہمارے سامنے آیا ہے، بڑی ناسپاسی ہوگی اگر ہم اُن کی اس خدمت کا شکریہ ادا نہ کریں مگر بڑی نا فرض شناسی ہوتی اگر ہم اپنے تاثرات کو تاریخ کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے ان تک نہ پہنچاتے،

ہمیں توقع ہے کہ فاضل مترجم اور ترقی اردو بورڈ نئی دہلی کے ذمہ داران اس نقد و تبصرہ میں جو باتیں صحیح پائیں، آئندہ ایڈیشن میں بشرطیکہ اس کی نوبت آئے) اس کی تصحیح میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں فرمائیں گے،

مقالات شبلی تنقیدی

(حصہ چہارم)

یہ مولانا شبلی کے تنقیدی مقالات کا مجموعہ ہے جو انھوں نے الندوہ، لکھنؤ اور دوسرے بلند پایہ رسالوں میں عربی و فارسی کی بعض اہم کتابوں پر لکھے تھے، اس میں مغل شہنشاہ نورالدین جہانگیر کے روزنامچہ تزک جہانگیری پر بھی ایک پر مغز مقالہ ہے، جس کی قوت تحریر، ذوق انشاء پردازی اور واقعہ نگاری سے مولانا بہت زیادہ متاثر تھے، اور اس کو فارسی ادب کی بہترین کتابوں میں شمار کرتے تھے،

قیمت ۹ روپے "منیجر"

اسلام اور مستشرقین پر دارالمصنفین کے بین الاقوامی سیمینار کے متعلق پاکستانی اہلِ قلم کے تاثرات

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی ریڈر
اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اسلام آباد

چند ماہ پہلے دارالمصنفین اعظم گڈھ کی طرف سے اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ایک بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کے دعوت نامے موصول ہوئے تو خواہش اور تمنا کے باوجود یہ بات ہم میں سے کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ ہم لوگ واقعی ایک دن شدِّ رحال کر کے اعظم گڈھ جیسے دور افتادہ مقام تک پہنچیں گے۔ بعد مسافت اور دشواریِ راہ کے علاوہ ایسا کوئی سامانِ کشش بھی نہ تھا جو بالعموم کانفرنسوں اور سیمیناروں میں مندوبین کو کشاں کشاں لئے جاتا ہے۔ ٹی اے ڈی اے کی چاٹ اور چاشنی یہاں سرے سے مفقود تھی۔ دارالمصنفین غریب مسلمانوں کا ایک علمی ادارہ ہے، جس کو نہ کسی حکومت کی سرپرستی حاصل ہے، نہ ہی اس کے پاس اپنے ایسے وسائل ہیں کہ وہ استحقاق اور مرتبے کے مطابق جاہ و منصب کے اعتبار سے اتنے بڑے بڑے لوگوں کے مصارفِ سفر کا بار اٹھا سکے۔ یہ بات ہمیں پہلے سے معلوم تھی اور شبلی اکیڈمی کے ناظم سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے بلطائف الحیل اس کی طرف اشارہ کر دیا تھا۔ اور جیسا کہ مشہور مقولہ ہے عقلمندان را اشارہ کافی است ہماری فراست نے فوراً اس کو بھانپ لیا کہ دارالمصنفین سفر خرچ نہیں دے گا۔ ہم پیشہ وہم مشرب

وہم راز ہونے کا یہ اثر تھا یا اس خصوصی تعلق کا نتیجہ جو سید صاحب موصوف ادارہ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے ساتھ مدت مدید سے رکھتے چلے آئے ہیں کہ انھوں نے دعوت ناموں کے اجرا میں انتہائی فیاضی سے کام لیا اور تھوک کے حساب سے بشمول ڈائرکٹر ادارے کے دس اسکالروں کو سیمینار میں شرکت کی دعوت بھیج دی، ظاہر ہے ادارہ بھی اپنے قواعد وضوابط کے اندر اتنے ڈھیر سارے لوگوں کو خرچ دینے کا متحمل اور مجاز نہیں ہو سکتا تھا۔ کارپردازانِ ادارہ نے بھی اصولی طور پر یہ طے کر دیا کہ جو شخص شریک ہونا چاہے۔ وہ اپنا خرچ خود اٹھائے، مگر لطف کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود ہر شخص آمادہ وتیار نظر آیا۔ شبلی اکیڈمی کی شہرت، عزت ساکھ اور وقار عام حالات میں بھی اہلِ علم کی توجہ اپنی طرف مبذول کرنے کے لیے کافی ہے لیکن خاص کر پاکستانی زائرین کے لئے ہندوستان کے وہ ادارے جو مسلمانوں کی عظمت کے نشان ہیں ان کی کشش انھیں دیوانہ وار کھینچتی ہے۔ اور ان کی زیارت کا کوئی موقع انھیں ملے تو وہ خرچ یا صعوبتِ سفر کی پروا نہیں کرتے۔ دارالمصنفین کے سفر میں یہ دونوں ہی رکاوٹیں موجود تھیں۔ راستہ دشوار اور سفر کی سہولتیں سرے سے مفقود۔ پھر بھی ہر پیر وجواں آمادۂ سفر۔ حد یہ کہ ہوائی جہازوں یا ایر کنڈیشنڈ گاڑیوں میں سفر کرنے والے بزرگ عام مسافر گاڑیوں میں سفر کرنے سے نہیں گھبرائے، ضعیف اور معمر ہونے کے باوجود انھوں نے عزمِ جواں کے ساتھ جوانوں کا ساتھ دیا۔ ہمارا وفد جو اسلام آباد سے جانے کے لیے آخری طور پر ترتیب پایا اس کے ارکان کی تعداد سات تھی۔ جس میں سے تین اشخاص ایسے تھے جن کی عمریں ۷۰ کے لگ بھگ ہونگی، ان کی ہمت کو داد دینی چاہیے۔ اور ان کے حوصلے کو آفریں کہنا چاہیے کہ انھوں نے ہم جوانوں کو مات دی۔ اور ان کے سن رسیدہ حوصلے نے ہماری ہمت بندھائی۔

ویزے کے لیے سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے ہندوستان کی وزارتِ خارجہ کا

ایک خط دعوت نامے کے ساتھ منسلک کر دیا تھا۔ جس کی وجہ سے اطمینان تھا کہ ویزا ملنے میں دشواری نہیں ہوگی، اور جہاں تک کہ ویزا ملنے کا تعلق ہے، واقعی اسمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی مگر یہ بات شرکائے کانفرنس کے لیے بے حد حوصلہ فرسا اور مایوس کن ثابت ہوئی کہ ویزا صرف ایک ہفتے کا اور صرف ایک جگہ کا دیا گیا۔

۱۰ فروری کی سہ پہر یہ قافلہ علم و دانش اپنے مختصر ساز و سامان کے ساتھ دلوں میں امید و یقین کی قندیلیں روشن کیے اسلام آباد سے لاہور روانہ ہوا۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

اور اس کے کرشمے یہیں سے ظاہر ہونے شروع ہو گئے۔ اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر این اے بلوچ نے از راہ کرم ہمارے آغاز سفر سے پہلے ہی مسافر نوازی کا عملی نمونہ پیش کیا، وہ خود ایک اسکالر ہیں اور اسکالر نوازی ان کے اخلاق حسنہ کا ایک نمایاں وصف ہے انھوں نے ادارے کے اسکالروں کی قدر افزائی کی۔ سرحد تک پہنچانے کے لیے یونیورسٹی کی ویگن مع ڈرائیوروں کے بھیج کر ان کی دعائیں لیں۔ ڈاکٹر صاحب کو بھی مدعو کیا گیا تھا، مگر وہ اپنی مصروفیات اور کثرت کار کی وجہ سے شرکت کے لیے وقت نہ نکال سکے۔ ان کی طرف سے معذرت اور صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے لیے نیک خواہشات کا پیغام ہم ساتھ لے گئے۔

نماز عصر سے پہلے تقریباً چار بجے جب یہ قافلۂ علم و دانش ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتے کی جائے قیام ایم۔ این۔ اے ہوسٹل اسلام آباد سے روانگی کیلئے ویگن میں سوار ہوا تو سب کی زبانوں پر "بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا" اور سبحان الذی سخر لنا ھذا کا ورد جاری تھا، کہ مسلمانوں کا اصل زاد راہ یہی ہے۔

از ساز و برگ قافلۂ بیخوداں مپرس
بے نالہ می رود جرس کاروان ما

اس قافلے میں ادارۂ تحقیقات اسلامی اسلام آباد کے ڈائرکٹر عبدالواحد ہالے پوتا کے

علاوہ مولانا سید عبدالقدوس ہاشمی سابق لائبریرین ادارۂ تحقیقات اسلامی جو پروفیسر کی حیثیت میں دوبارہ ادارے سے منسلک ہو گئے ہیں اور مفتی مولانا سیاح الدین کاکاخیل رکن کونسل آف اسلامک آئیڈیولوجی دو قابل ذکر بزرگ ہستیاں شامل تھیں باقی ادارے کے ہم چند نوجوان اسکالر تھے جو خود دوں میں ہونے کے باعث گمنام رہنا ہی پسند کریں گے۔

ہم سا کوئی گمنام زمانے میں نہ ہوگا
گم ہو وہ نگیں جس پہ کھدے نام ہمارا

مگر ایسا بھی نہیں کہ وہ پردے میں رہنا چاہتے ہوں۔ ان کے نام ظاہر کر دیے جائیں، تو یہ پردہ دری نہیں ہوگی، محمود احمد غازی، احمد خاں، حافظ محمد طفیل اور راقم الحروف۔

اس سفر میں ہاشمی صاحب کی رفاقت ایک نعمت غیر مترقبہ تھی، ان کی نسبت تجربے کے بعد ہر پڑھے لکھے آدمی کا تاثر یہی ہوگا کہ وہ اپنی ذات سے ایک لائبریری بلکہ ایک ادارہ (مجمع البحوث) ہیں۔

بہت لگتا ہے جی صحبت میں انکی
وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہیں

وہ کسی مسئلے پہ بند نہیں
ع اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

ادھر سفر شروع ہوا ادھر انھوں نے علوم و فنون کے دریا بہانے شروع کیے، وہ ایک عالم دین ہیں، علمی اور دینی مباحث پر ان کی عالمانہ گفتگو بھی انسان کو ورطۂ حیرت میں ڈالنے والی ہوتی ہے، لیکن زیادہ تعجب اس وقت ہوتا ہے جب وہ دنیا جہان کے مختلف موضوعات پر بولتے ہیں، فنون لطیفہ، تاریخ مذاہب، تقابل ادیان، علم الاصنام سے لیکر آجکل کے نام نہاد علوم جدیدہ پر جس علم و اعتماد کے ساتھ اظہار خیال کرتے ہیں اس کو دیکھ کر بس خدا کی شان نظر آتی ہے، کسی عربی شاعر نے درست ہی کہا تھا۔

ولیس علی اللہ بمستنکر
ان یجمع العالم فی واحد

بتوں کے آستانے البتہ پجاریوں کے بغیر بھی زندگی کے آثار سے پر تھے، یہ تھا وہ شہر جس میں ہزار میل کا سفر طے کرکے ہم پہنچے تھے، یہاں کون تھا، کیا تھا جس کی کشش ہمیں اور ہماری طرح اور بہت سے لوگوں کو دور دراز سے کھینچ کر لائی تھی، اور ہم کشاں کشاں چلے آئے تھے اس سوال کے جواب میں اس شہر کی سو سال کی تاریخ اپنی علمی اور دینی روایات کے ساتھ مجسم ہو کر ہمارے سامنے آکھڑی ہوتی ہے، اور اشارہ کرکے بتاتی ہے، یہ فاروقی چریا کوٹی ہیں، یہ شبلی نعمانی ہیں، یہ حمید الدین فراہی ہیں، یہ سلیمان ندوی ہیں، یہ عبدالسلام ہیں، یہ شاہ معین الدین ہیں، یہ سید صباح الدین عبدالرحمن ہیں۔ یہ دار المصنفین ہے، یہ سیرۃ النبی ہے، یہ معارف ہے، ان ہی کے دم سے یہ گمنام شہر شہرۂ آفاق بنا، ان ہی کی دعوت پر ہم آج یہاں آئے تھے، میں اعظم گڈھ شہر اور دار المصنفین کے ان پہلوؤں کے بارے میں جن کو دور دیس کے لوگ نہیں جانتے پہلے ہی اپنے ان ساتھیوں کو سب کچھ بتا دیا تھا، جو پہلی بار یہاں آرہے تھے، تاکہ اگر ان کے تصور اور تجربے میں کہیں فرق و اختلاف نظر آئے تو وہ پریشان نہ ہوں، مثلاً یہ کہ اعظم گڈھ ایک چھوٹا سا شہر ہے، ہندوستان یا پاکستان کے بڑے شہروں کی چمک دمک اور زندگی کی سہولتیں وہاں نہیں ملیں گی، وہاں کوئی بڑا کیا چھوٹا بھی ہوٹل ایسا نہیں ہے جس میں ٹھہرا جاسکے، اسی طرح بازار سے بستروں کے حصول کا رواج بھی وہاں نہیں ہے، کانفرنس کی طرف سے ہمیں بستر ساتھ لانے کو کہا گیا تھا جس سے ہمارے بعض ساتھیوں کو ایک گونا تردد سا تھا۔ اعظم گڈھ اور دار المصنفین سے میں اچھی طرح واقف تھا، اس علم و آگہی کی بنیاد پر میں نے پہلے سے اپنے ذہن میں کانفرنس اور اس کے انتظامات کے بارے میں ایک نقشہ بنا لیا تھا، لیکن یہاں جو نقشہ نظر آیا وہ یکسر مختلف تھا، مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دار المصنفین کو کہیں سے الہ دین کا جادوئی چراغ ہاتھ آگیا ہے، اور کچھ جن ان کے قابو میں آگئے ہیں، جن کی مدد سے انھوں نے جنگل میں منگل کا وہ سماں

ان کی ایک ہفتہ کے سفر کی گفتگوئیں اور تقریریں قلمبند کرکے جمع کی جائیں تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوجاتی، اور اس میں ایسے ایسے مسائل اور نکتے ہوتے کہ شاید دو بڑے ادارے کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ہائے پوتا صاحب بے خود ہو کر بار بار کہتے رہے کہ کاش مولانا کی یہ باتیں ٹیپ ریکارڈ میں محفوظ کرلی جاتیں، آغاز سفر میں مولانا کا زور طبیعت زیادہ تر ادب اور شعر و شاعری کی طرف رہا، انھوں نے امیر مینائی کو اردو کا سب سے بڑا شاعر قرار دیا جس سے میں نے اختلاف کیا مولانا نے ان کے چیدہ چیدہ پسندیدہ اشعار سنائے اور کہا کہ اردو تو ایک طرف دنیا کی کسی زبان میں اس پایہ کا شعر پیش نہیں کیا جاسکتا، بقول ان کے موت پر امیر کے اس شعر سے بہتر شعر پیش کرنا ممکن نہیں۔

مدت سے امیر اس سے ملنے کی تمنا تھی آج اس نے بلایا ہے لینے کو قضا آئی

میں نے کہا یہ شعر ایک مسلمان شاعر ہی کہہ سکتا ہے، نام کا مسلمان نہیں، واقعی مسلمان، امیر مینائی کے اس شعر کو بھی مولانا نے دوران سفر متعدد بار دہرایا۔

کسی رئیس کی محفل کا ذکر کیا ہے امیر خدا کے گھر بھی نہ جائیں گے بے بلائے ہوئے

اردو ہندی فارسی کے سینکڑوں بلکہ ہزاروں اشعار مولانا کی زبان سے نکل کر فضا میں تحلیل ہوگئے، اردو شعراء میں میر، سودا، غالب، مومن، داغ، امیر مینائی، اقبال، اور محسن کاکوروی کا ذکر زیادہ رہا۔

اعظم گڈھ شہر میں داخل ہوئے تو ہر طرف سناٹا تھا، چھوٹا سا شہر نہ کشادہ سڑکیں، نہ عالیشان عمارتیں۔ وہ بھی رات کے سناٹے میں سویا ہوا۔ دوکانیں بند۔ سڑکیں روشنی سے محروم، ابھی بارہ نہیں بجے تھے مگر ہر طرف ایک ہو کا عالم تھا۔ راستے میں نصب بعض

باندھا ہے کہ شاید و باید، مجھے دوسروں کے ردعمل کا علم نہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ میں نے حیرت و استعجاب
اور فخر و انبساط کے ملے جلے جذبات کے ساتھ انتظامات کے مختلف پہلوؤں کو دیکھا۔ ہم جس وقت
کانفرنس کی حدود میں داخل ہوئے بارہ ۱۲ کا عمل ہوگا۔ اعظم گڈھ شہر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد
جو عالم نظر آیا تھا اس کے مقابل کانفرنس کے دنیوں کی دنیا اور ہی تھی۔ رات ہونے کی وجہ سے
یہ فرق اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ دارالمصنفین کا اپنا رقبہ نسبۃً بہت محدود اور تھوڑا ہے، مگر
اس کے ساتھ شبلی ہائی اسکول اور شبلی کالج کے رقبے ملالیں تو پھر اس کی وسعت اتنی بڑھ جاتی ہے
کہ اس کی سمائی میں کئی گنا کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ شبلی ہائی اسکول شبلی کالج اور شبلی اکیڈمی کو شبلی کے
نام ہی نے نتھی نہیں کر رکھا ہے، یہ تینوں ادارے اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بھی باہم دگر ملحق
اور متصل ہیں، اعظم گڈھ شہر میں مسلمانوں کے یہ تینوں قومی ادارے اس طرح واقع ہیں کہ وہ
ایک مثلث کے تین زاویے ہیں۔ یوں وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت کی یہ ایک
جلوہ گاہ ہے۔ ان کی عمارتیں اور احاطے ہی نہیں، ان کے صدر دروازے بھی الگ الگ ہیں،
لیکن اندر سے راستے نکال کر ان کو ملا دیا گیا ہے۔ کانفرنس کی تاریخیں مقرر کرنے میں اس امر کا
خیال رکھا گیا تھا کہ شبلی اکیڈمی کی اس تقریب کے لیے ان تعلیمی اداروں سے کام لیا جا سکے اور
تعلیم کا زیادہ ہرج بھی نہ ہو۔ ہماری ٹیکسیاں شبلی کالج کے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔ گیٹ کے
اندر داخل ہوتے ہی ہم سب اتر گئے۔ جلسہ گاہ پر ایک طائرانہ نظر ڈالی، شبلی کالج کے وسیع
و عریض گراؤنڈ میں خیموں، شامیانوں اور قناتوں کی ایک بستی آباد تھی، جس کی ایک ایک
چیز سے نفاست، خوش سلیقگی اور بلند معیاری نمایاں تھی۔ مجھے زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ
اتنا اعلیٰ درجے کا ساز و سامان آیا کہاں سے ...... صاف ستھرے نئے خوش رنگ شامیانے
عمدہ فرنیچر، فرش فروش جھاڑ فانوس ہر چیز سے امارت ٹپکتی تھی، جیسے کسی بادشاہ نے سفر میں

پڑاؤ کیا ہو یا کسی امیر کبیر کے ہاں برات آنے والی ہو یا جشنِ طرب منایا جا رہا ہو۔ برقی قمقمے اور
بجلی کے راڈ محض روشنی فراہم کرنے کے لیے نہیں لگائے تھے، بلکہ ان سے آرائش و زیبائش کا کام
بھی لیا گیا تھا۔ آدھی رات کے وقت خیموں کی اس بستی میں کوئی کمیں نظر نہیں آیا پھر بھی اس کی
رونق دوچند تھی۔ اعظم گڈھ جیسی چھوٹی جگہ میں مادی وسائل سے محروم ایک ادارے کا یہ اہتمام
دیکھ کر منتظمین کے عزم و حوصلہ کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا۔ ہماری ٹیکسیاں شبلی کالج کے
کمپاؤنڈ میں دارالمصنفین کو ملانے والے دروازے کے پاس کھڑی ہوئیں۔ ہم سید صباح الدین
صاحب کے دولت خانے کی طرف گئے۔ ان کی رہائش دارالمصنفین ہی کے ایک گوشے میں مہمان
خانے کے ساتھ ہے، دارالمصنفین کو دلھن کی طرح سجایا گیا تھا، شبلی منزل کی اپنی ایک شان ہے
جو اس کے وجود کا ایک مستقل اور نمایاں وصف ہے، اور جس کو کسی وقت بھی آنے والا کوئی
شخص دیکھ سکتا ہے لیکن آج کی سج دھج دیکھ کر یہی گمان گذرا کہ جیسے اس گھر میں آج کی رات
کوئی بڑی برات آنے والی ہو، برات کے ٹھہرنے کی جگہ کے مقابل دلھن کے گھر کی سجاوٹ عموماً
زیادہ ہوتی ہے کہ باہر سے آنے والے خود بخود پہچان لیں کہ دلھن کا گھر یہی ہے، میں نے اگر شبلی منزل
کو پہلے نہ دیکھا ہوتا تو بھی مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگتی کہ آج ہم جس گھر کے مہمان ہو کر آئے ہیں
وہ یہی ہے۔ دارالمصنفین کی ہر چیز تجدید کے عمل سے گزری تھی، روشیں اور راستے تک آراستہ
و پیراستہ تھے، اصل عمارت رنگ روغن کے بعد برقی شعاعوں کی بارش میں نہائی ہوئی واقعی
کسی نو عروس کا پیکر معلوم ہوتی تھی، اور دارالمصنفین کی ننھی منی خوبصورت مسجد کو تو رنگ برنگ
برقی قلقلوں کی لڑیوں سے ڈھک دیا گیا تھا۔ اس پورے منظر میں مسجد کا نظارہ سب سے زیادہ
جالب توجہ تھا۔ کہ تجدید و تزئین کے اس عمل میں سب سے زیادہ توجہ اسی پر صرف کی گئی تھی۔
اس سے شبلی اکیڈمی میں مسجد کے مقام کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے، اپنا گھر سجانے میں دنیا جہان کا

تکلف کرنے والے عموماً خدا کے گھر کو بھول جاتے ہیں۔ مسجد کے پاس ہی پائینتی میں ایک طرف مرقد شبلی ہے، جس پر کتبہ لگا ہوا۔ قبر کے چاروں طرف ڈیڑھ دو فٹ کی پختہ دیوار اٹھا کر بکس بنا دیا گیا ہے اور اوپر کا حصہ کھلا رکھا گیا ہے، جس میں مٹی بھری ہوئی ہے، اعظم گڈھ ضلع میں علماء اعظم گڈھ خصوصاً شبلی اور فراہی کی علمی اور فکری تحریک کے اثر سے شرک و بدعت اور قبر پرستی وغیرہ کی خرافات بہت کم نظر آتی ہیں۔ ورنہ آج کے دن سب سے زیادہ بناؤ سنگھار کی مستحق یہ قبر ہوتی جو بالکل ویران و سنسان پڑی زبان حال سے زیب النساء مخفی کا یہ شعر دہرا رہی تھی:

برمزارِ ما غریبان نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

لیکن نہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ آج کا یہ سارا ہنگامہ یہ تمام رونق اور چہل پہل اُس شخص کے دم قدم سے نہیں تھی جو اس قبر کہنہ میں مدفون ہے۔ یہ شبلی ہی کا جشن تھا، یہ شبلی ہی کا عرس تھا، یہ شبلی ہی کا میلہ تھا، یہ شبلی ہی کا چراغاں تھا۔ لیکن اہل شرک و بدعت کے طریق پر نہیں بلکہ اس طریقے پر جو قامع شرک و بدعت اور علمبردار علم و حکمت ہونے کی حیثیت سے شبلی کے شایانِ شان تھا۔ شبلی اکیڈمی کے رہائشی حصے میں داخل ہونے سے پہلے ہمارا قافلہ تھوڑی دیر کے لیے رکا شاید اس لیے کہ یہاں کئی چیزیں ایسی تھیں جو نوواردوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ میری زبان سے یوں ہی نکل گیا، یہ سامنے مرقد شبلی ہے، پہلے چل کر فاتحہ پڑھ لیں۔ ہم نوجوان جن کا علم اور مطالعہ ابھی تشنۂ تکمیل ہے، قدم اٹھا کر چلنے والے ہی تھے کہ مولانا ہاشمی نے ایک فقرہ کہہ کر بریک لگا دی۔ قبر پر جا کر فاتحہ پڑھنا بھی گویا ان بدعات سیأت میں سے ہے جو ناواقف لوگ دین کا حصہ سمجھ کر کرتے ہیں۔

سید صاحب کے در دولت پر دستک دی گئی۔ ان کے صاحبزادے ابھی اٹھے ہوئے نہیں تھے معلوم ہوا کہ وہ نیند کا ٹیکہ لگوا کر ابھی ابھی سوئے ہیں۔ صاحبزادے ان کو جگانے

کے لیے جانے لگے مگر ہم نے بہ تاکید منع کیا اور ان سے درخواست کی کہ ہمیں ہماری جائے قیام تک پہنچا دیں۔ اس دوران کانفرس کے کچھ کارکن اپنی صوابدید کے مطابق ٹیکسیاں ان خیموں کی طرف لے جا چکے تھے، جو ابھی تک خالی تھے۔ اور ہماری آمد کے منتظر تھے۔ شبلی کالج کے گراونڈ میں خاص مندوبین کے لیے خیموں کی ایک بستی بسائی گئی تھی۔ جس کے چاروں طرف قناتیں کھڑی کر کے حصار سا بنا دیا گیا تھا، ترتیب سے لگے ہوئے ایک ہی طرز کے خیمے دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے مجھے ایام حج میں عرفات اور منا کا نقشہ یاد آگیا۔ اس میں اسلامیت عربیت اور مشرقیت ہی نہیں بدویت اور صحرائیت کا بھی مزہ تھا۔ جو شہروں کی بناوٹی اور مشینی زندگی کی نسبت فطرت سے بہت قریب تھا۔ اس میں فطرت کی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ مجھے خیمے دیکھ کر بدو اور اونٹ کی مشہور حکایت یاد آگئی حالانکہ یہاں ان دونوں میں سے کوئی بھی نہ تھا۔ کچھ عرب مندوب بھی مدعو تھے، اور غالباً انہی کی رعایت سے کانفرنس کے منتظمین نے اسکول اور کالج کے بے شمار کمروں کو نظر انداز کر کے صرف کثیر سے صحرا میں شہر نہیں جو آسان کام ہے۔ شہر میں صحرا بنانے کا تکلف کیا تھا، اس کے لیے اہل کانفرنس کو کیا پاپڑ بیلنے پڑے اور مصارف کا کتنا بڑا بوجھ اٹھانا پڑا۔ میں اوپر بیان کر چکا ہوں کہ اعظم گڈھ قصبہ کے معیار کا ایک چھوٹا سا شہر ہے۔ یہاں کسی کے گھر سے تو ڈھنگ کی چارپائی بستر مل سکتا ہے مگر بازار سے اس کا حصول ممکن نہیں۔ میں حیران اور متجسس تھا کہ کانفرنس کے لیے اس معیار کے اتنے وسیع انتظامات کیسے کیے گئے۔ کسی متعلق ذمہ دار آدمی سے اس پر گفتگو کا موقع نہ ملا، کچھ باتیں جو ادھر ادھر سے کانوں میں پڑیں ان سے معلوم ہوا کہ اس کے پیچھے بے ستون و کوہکن کی ایک پوری داستان ہے۔ پہاڑوں کی سخت چٹانیں کاٹ کر یہ جوئے شیر لائی گئی ہے۔ اس خیال سے کہ مہمانوں کو تکلیف اور شکایت نہ ہو۔ ہر چیز لکھنؤ سے

منگوائی گئی۔ کانفرنس کی سج دھج اور ساز وسامان کی بلند معیاری کی نسبت میرے ذہن میں
جو سوالیہ نشان تھا لکھنؤ کا نام سن کر مجھے میرے ہر سوال کا جواب اس طرح مل گیا تھا کہ استفہام
کا کوئی شوشہ باقی نہ رہا۔ لکھنؤ اور اعظم گڑھ کا فاصلہ دو سو میل سے کم نہ ہوگا۔ حمل ونقل کے مصارف
ہی اتنے اٹھے ہونگے کہ ان کا اندازہ مشکل ہے۔ ایک صاحب نے بتایا کہ سامان سے لدے ہوئے
۱۲ ٹرک تو میں نے گنے جو میرے سامنے آئے معلوم نہیں ان خیموں کا کرایہ کتنا دیا گیا ہوگا۔
باقی شامیانوں، قناتوں، دریوں، قالینوں، چارپائیوں، بستروں، میزوں، کرسیوں اور
صوفوں، کھانے پینے کے برتنوں، بجلی کے سامانوں اور دیگر ضروریات، حاجیات وکمالیات پر
جو رقم خرچ ہوئی ہوگی وہ علیحدہ ہے۔ یہ اہتمام دارالمصنفین کے غریب میز بانوں نے اپنے عزیز مہمانوں
کے آرام وآسایش اور اعزاز واکرام کے لیے نہیں تو اور کس لیے کیا۔ اس پر بھی کسی کو شکایت رہ گئی ہو
جو بالکل فطری بات ہے تو اس کے لیے شریفانہ طرز عمل یہی ہے کہ وہ درگذر سے کام لیں۔ اور
دوست کی طرح خود ان کی طرف سے بہتر عذر تلاش کرے۔ حکومتوں کی طرف سے منعقد ہونے
والے سمیناروں یا حکومتوں کی سرپرستی میں قائم اداروں کی طرف سے منعقد ہونے والی کانفرنسوں
میں جس طرح بے دریغ روپیہ خرچ کیا جاتا ہے معلوم ہے پھر بھی شکایات رہ جاتی ہیں۔ دارالمصنفین
کے سفرۂ علم وادب سے زلہ ربائی کرنے والے کسی شخص کو اس سے یہ شکایت نہیں ہوسکتی کہ
اس کو ہوائی جہاز کا کرایہ نہیں دیا گیا یا فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرنے کی عیاشی فراہم نہیں کی گئی،
دارالمصنفین نے اپنے مہمان مندوبین کے عافیت وآرام کے لیے جو کچھ کیا اپنی بساط اور حیثیت سے
بڑھ کر کیا۔

ہمارے قافلے کے سات ارکان کو شمال مغربی کونے کے چار خیموں ۱۱-۱۲-۱۳-۱۴
میں ٹھہرایا گیا۔ ڈاکٹر ہانے پوتا کے لیے ایک خیمہ مخصوص کر دیا گیا۔ باقی ہم دو دو کرکے

ٹھہر گئے۔ ہر خیمہ جملہ ضروریاتِ زندگی کے لیے خود مکتفی تھا سوائے کھانے کی جگہ کے کہ اس کا
انتظام اجتماعی تھا جس کے لیے خیموں کی اس بستی کے وسط میں شامیانے لگا کر ڈائننگ
اور ڈرائنگ کی اکٹھے جگہیں بنائی گئی تھیں، ہر خیمہ تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصے کو ڈرائنگ
روم بیٹھک یا دالان کہہ لیجیے جس میں دو چھوٹی میزیں اور دو آرام کرسیاں دری کا فرش
بچھا کر رکھ دی گئی تھیں۔ اس کے بعد کا حصہ بیڈ روم یعنی سونے کا کمرہ تھا جس میں برابر سے
لوہے اور نواڑ کی دو چارپائیاں نیچے دری کا فرش بچھا کر ڈال دی گئی تھیں۔ یہ کمرہ مربع اور
اتنا کشادہ تھا کہ دو چارپائیوں کے بعد بھی سامان اور چلنے پھرنے کے لیے کافی گنجایش تھی،
اس کے بعد کا حصہ لیٹرن باتھ اور ڈریسنگ کی ضرورتوں کے لیے تھا۔ پانی کے لیے بالٹیاں
اور حاجت کے لیے کموڈ اور نہانے کے لیے چوکی موجود تھی۔ مہتر اور بھشتی کی آمد ورفت کے لیے
اس میں ایک دروازہ باہر سے بھی تھا۔ پانی کے نکاس کے لیے خیمے کے باہر گڑھا کھود کر
نالی بنا دی گئی تھی۔ یہ خیمہ گویا دو آدمیوں کی رہایش کے لیے ایک مکمل یونٹ تھا۔ روشنی کے لیے
بجلی کے تار لگا دیے گئے تھے۔ اور اس کا کنٹرول خیمے کے اندر ہی تھا۔ اعظم گڑھ میں بجلی کا نظم
بہت اچھا نہیں۔ خیمے میں کھڑکیاں یا روشندان جیسی کوئی چیز نہیں تھی اس لیے جس وقت
بجلی نہیں ہوتی تھی خیمے کے اندر دن میں بھی بلیک آؤٹ ہوتا تھا جب کہ باہر سورج کی روشنی
سے نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔

موسم ابھی سرد تھا۔ کھلے میدان میں خیموں کے اندر سردی غیر متوقع نہ تھی ہلکے پھلکے
بستر کانفرنس کی طرف سے بھی مہیا کیے گئے اور کچھ ہم بھی ساتھ لائے تھے۔ یوں گذارے کی
صورت نکالی گئی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ جلد بستروں میں گھس کر دراز ہوگئے،
جگہ کی معمولی تبدیلی نیند میں خلل کا باعث ہوتی ہے۔ یہاں تو زمین وآسمان بدلے ہوئے تھے۔

نہیں معلوم کب اور کیسے نیند آئی۔ اور آئی بھی یا نہیں۔ رات دیر سے سونے کے باوجود صبح جلدی ہی بستر چھوڑ دیا گیا۔ رات تو بسر ہو گئی، گو کہ صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا۔ اب صبح کے مسائل کا چیلنج تھا۔ الانسان عبید العادات۔ ہم ان طریقوں کے عادی نہ تھے۔ بالآخر ورڈس ورتھ کے فلسفہ رجوع الی الفطرہ کو کام میں لانا پڑا۔ ضروریات سے فراغت کے بعد دار المصنفین کی مسجد جا کر فجر کی نماز ادا کی۔ تینوں اداروں کے درمیان یہی ایک مسجد ہے۔ اسکول اور کالج کے لوگ بھی نماز کے لیے یہیں آتے ہیں۔ رات ہم نے دور ہی سے اس کا نظارہ کیا تھا۔ اس کا چراغاں جاذب نظر تھا۔ صبح اندر کی حالت سے بھی ہمارے اس خیال کی تائید ہوئی کہ مسجد کو خصوصی توجہ سے نوازا گیا ہے۔ گویا

ع آباد ایک گھر ہے جہانِ خراب میں

جو لوگ اللہ کے گھر کی آبادی کا خیال رکھتے ہیں، اللہ انھیں اپنی رحمت سے نوازتا ہے۔

صبح پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ ہم نہانا چاہتے تھے پر ہمت نہ ہوئی۔ شہر کے بارے میں مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔ مگر پھر بھی حمام کی تلاش میں نکلے جس میں ناکامی ہوئی۔ بالآخر ہاتھ منہ دھونے پر اکتفا کیا گیا۔ صبح سویرے صباح الدین صاحب ہم پاکستانیوں کے استمزاج کے لیے تشریف لائے، معذرت اور عفو خواہی سے شرمندہ کیا۔ مجھے تاکید کی کہ ان کی طرف سے پاکستانی مہمانوں کا خیال رکھوں جستجو ہوئی کہ مندوبین میں کہاں کہاں سے کون کون آیا ہے۔ اتنا وقت نہ تھا کہ ایک ایک خیمے کی تلاشی لی جاتی، صحبتِ غیر میں گاہے ماہے سرِ راہے گاہے۔ جس سے جہاں ملاقات ہو گئی ہو گئی۔ کسی سے کھانے کی میز پر، کسی سے کمرہ انتظار میں، کسی سے مسجد میں، کسی سے جلسہ گاہ میں، کسی سے آتے جاتے راستے میں۔ اس طرح جو مل گیا سو مل گیا۔ جو رہ گیا سو رہ گیا۔ کسی سے ملاقات اور علیک سلیک ہوئی کسی کی شکل دیکھی کسی کا نام سنا۔ باقاعدہ ملنا کسی سے نہ ہوا حتی کہ خود

صباح الدین صاحب کی ملاقات اور دار المصنفین کی زیارت بھی ایسی ہی رہی جیسا کہ کسی شاعر نے کہا ہے۔

بامن آویزش او الفت موج است و کنار — دمبدم بامن و ہر لحظہ گریزان از من

ایک خوشگوار حادثہ یہ پیش آیا کہ مولانا سعید احمد اکبر آبادی سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ان کے انتقال کی خبر پاکستان میں ایک نہیں متعدد ذریعوں سے سنی جا چکی تھی۔ اور بعض ذریعے تو ایسے مستند تھے کہ ایمان نہ لاتے تو کافر قرار پاتے۔ یقین کرتے ہی بنی۔ تو ہم پرست یا ضعیف الاعتقاد ہوتے تو انکو دیکھ کر بھاگتے، ڈر کر شور مچاتے، مل کر خوشی ہوئی۔ شکر ادا کیا کہ خبر غلط نکلی۔ میں نے مولانا کو قصہ سنایا تو ہنسے اور خود ہی اس کی توجیہہ فرمائی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ کانفرنس میں قیام کے بعد طعام بھی ایک ایسا مسئلہ ہوتا ہے جس سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اور اس کے حسن و قبح سے پوری کانفرنس متاثر ہوتی ہے۔ لذت کام و دہن کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو تو سب کیے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے منتظمین اس نکتے سے بخوبی آگاہ تھے۔ اعظم گڑھ کی روایات میں ہے کہ جب کہیں بہت عمدہ کھانا کھاتے ہیں تو کہتے ہیں شادی جیسا کھانا تھا۔ کانفرنس میں شروع سے آخر تک اسی قسم کا ناشتا کھانا سرو کیا جاتا رہا۔ صباح الدین صاحب اور علی میاں کے اشتراکِ عمل نے جہاں کانفرنس کو دوسرے پہلوؤں سے کامیاب بنانے میں اہم کردار ادا کیا وہاں اس پہلو کو تشنۂ تکمیل نہ چھوڑا۔ عمدہ سے عمدہ کھانے کھلائے۔ دورانِ سفر دال اور سبزی کھا کھا کے ہم لوگ بور اور بیزار ہو چکے تھے۔ گوشت کی اشیا کے لیے ترس گئے تھے۔ لحمیہ کھانا کیسا بھی ہوتا اس کی پذیرائی ہوتی اور قدر کی جاتی لیکن یہاں روایتی انداز کا اہتمام کر کے جس طرح کھانے تیار کرائے جاتے رہے اہل ذوق نے اس کی داد دی اور میں نے تو یوں محسوس کیا جیسے ایک مدت کے بعد اتنے عمدہ کھانے کھائے ہوں۔ باورچی

لکھنؤ سے لایا گیا تھا۔ اور اس کے انتخاب میں یقیناً علی میاں کی پسند کو دخل رہا ہوگا۔ جو یوں تو درویش صفت انسان ہیں لیکن کھانے کے باب میں ذوق شاہانہ رکھتے ہیں۔ شبلی کالج کے وسیع گراؤنڈ میں چاروں طرف جہاں رہائشی خیمے نصب تھے گراؤنڈ کے بیچ میں کھانے کا انتظام تھا۔ شامیانوں اور قناتوں کی مدد سے دو وسیع اور رفیع ہال تعمیر کیے گئے تھے ایک بیٹھنے کے لیے دوسرا کھانے کے لیے۔ ڈائننگ ہال میں کھانے کے لیے میز کرسی رکھی گئی تھی، ڈرائنگ روم میں قالین کے فرش پر صوفے اور آرام کرسی کی قطاریں قرینے سے آراستہ تھیں، چھت اتنی بلند تھی کہ اس کو دیکھنے کے لئے ارادہ کو کام میں لانا پڑتا تھا۔ نظر اٹھی تو دیکھا کہ چھت جھاڑ فانوس سے مزین ہے۔ میں نے اسے بطور تائید مزید کے نوٹ کیا کہ سارا ٹھاٹ شادی یا جشن کا ہے۔ اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر منعقد ہونے والے اس سمینار میں شادی یا جشن کا پہلو تلاش کرنا شاید ائل اور بے جوڑ سی بات ہو مگر یہ بات منطقی کم اور ذوقی زیادہ ہے۔

وللناس فیما یعشقون مذاہب

۱۲ر فروری کو صبح ساڑھے نو بجے سمینار کے افتتاحی اجلاس کا پروگرام تھا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اجلاس میں شرکت کے لیے تیار ہو رہے تھے۔ اتنے میں پتہ چلا کہ عرب مہمان جو بنارس میں رک گئے تھے نہیں پہنچے۔ ان میں ایک صاحب صدر بھی تھے، ساڑھے دس بجے کارروائی کا آغاز ہوگیا۔ باہر سے آئے ہوئے مندوبین کو اسٹیج پر جگہ دی گئی۔ کرسی صدارت پر جامعۂ قطر میں شعبۂ دینیات کے صدر، ڈاکٹر یوسف قرضاوی متمکن ہوئے۔ ان کے داہنے صباح الدین عبدالرحمن صاحب اور بائیں علی میاں رونق افروز رہے۔ ندوہ کے انڈونیشی طالب علم فہمی زمزم نے تلاوت کی۔ تلاوت میں قرآن مجید کے دو ٹکڑے شامل تھے۔ ایک واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعا

اور دوسرا اِنّ اکرمکم عند اللّٰہ اتقاکم۔ تلاوت کے بعد پیغامات پڑھ کر سنائے گئے۔

شیخ عبدالعزیز آل مبارک، ڈاکٹر عبدالسلام حارس، ڈاکٹر معروف دوالبی کے خطوط جو علی میاں کے نام تھے پڑھے گئے۔ ان خطوط کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا۔ ۱۱ بجے مولانا صباح الدین عبدالرحمن نے اردو میں خطبۂ استقبالیہ پڑھ کر سنایا اس کا عربی ترجمہ اجمل اصلاحی استاذ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ نے پیش کیا۔ اس کے بعد علی میاں نے اپنا کلمۃ الترحیب اردو میں پیش کیا۔ عرب مندوبین کے لیے اس کا عربی ترجمہ کیا گیا۔ علی میاں نے اپنی تقریر میں کہا مستشرقین کی مساعی کا اعتراف کیا جانا چاہیے۔ اسلامی علوم و فنون کی طباعت و اشاعت کے سلسلے میں انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں ہمیں ان کا احسان ماننا چاہیے لیکن ہمیں یہ بھی نظر میں رکھنا چاہیے کہ اسلامی علوم کے مطالعہ سے ان کا ایک خاص مقصد تھا۔ اور وہ یہ کہ لوگوں کو اسلام اور اسلامی علوم و فنون سے گھن آئے۔ انھوں نے خوردبین لے کر نقائص اور معائب تلاش کرنے کی دانستہ کوشش کی ہے۔ کسی کام کا حسن و قبح نیت پر موقوف ہوتا ہے۔ مستشرق فضلاء میں سلبی ذہانت بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اسلام کی تاریک تصویر پیش کی ہے۔ افسوس کہ ہمارے بہت سے مستشرقین نے سینیٹری انسپکٹر کا کردار ادا کیا ہے۔ ہمیں ان سے شکوہ ہے کہ انھوں نے اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام نہیں لیا۔ علم و تحقیق کے صحرا میں وہ یقیناً ہمارے شریکِ سفر ہیں، لیکن انھوں نے اسلام کے چمنستان میں چن چن کر کانٹے تلاش کیے۔ تاریخ اسلام، سیرت نبویؐ اور ہمارے علوم کا انھوں نے نکتہ چیں نگاہ سے مطالعہ کیا، اسلامی تمدن میں انھیں صرف دو باتیں نظر آئیں، حرم سرا اور اونٹ۔ امریکن اسکالروں نے اپنے عوام کو مسلمانوں کے بارے میں یہی تصور دیا ہے۔

علی میاں کی تقریر کے بعد پاکستانی مندوبین میں سے حکیم محمد سعید، مولانا عبدالقدوس ہاشمی اور مفتی سیاح الدین کاکاخیل نے مختصراً اظہار خیال کیا۔ مولانا ہاشمی نے اسلامی یونیورسٹی

اسلام آباد کے وائس چانسلر ڈاکٹر بلوچ کی طرف سے پیغام تہنیت بھی پیش کیا۔ ڈربن یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر سلمان ندوی ۲۵ سال کے بعد یہاں آئے تھے، انھوں نے اپنے والد بزرگوار مولانا سید سلیمان ندوی کے لگائے ہوئے اس چمن میں آکر پرانی یادیں تازہ کیں۔ انھوں نے اپنی مختصر گفتگو میں کہا کہ دارالمصنفین کی تاسیس کا مقصد ہی مستشرقین کے حملوں کا دفاع تھا، یہ سمینار اب سے بہت پہلے ہونا چاہیے تھا۔ سلمان صاحب نے بھی اردو میں باتیں کیں۔ تھائی لینڈ بنکاک کی جمعیت اسلامی کے مندوب ابراہم قریشی نے انگریزی میں اپنے احساسات کی ترجمانی کی، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے وائس چانسر جناب سید حامد، صدر شعبۂ تاریخ پروفیسر خلیق احمد نظامی، شبلی کالج کے سابق پرنسپل شوکت سلطان اور ظہران یونیورسٹی کے استاذ ظفر اسحاق انصاری نے پانچ پانچ منٹ میں اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ ایک بج کر ۴۵ منٹ پر ڈاکٹر یوسف قرضاوی خطبۂ صدارت کے لیے کھڑے ہوئے۔ پندرہ منٹ انھوں نے عربی میں تقریر کی، ٹھیک دو بجے جلسے کے اختتام کا اعلان ہوا۔ تقریباً چار گھنٹے کی نشست کے بعد ہم جلسہ گاہ سے اٹھے اور طعام گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ لذت طعام کی کیفیت ہمیں یاد رہے گی، مکان، ظرف اور مظروف ہر شئی لاجواب تھی۔ دارالمصنفین کا مہمان ہونے کا شرف مجھے پہلے بھی بارہا حاصل ہوا ہے، خواندہ کم ناخواندہ زیادہ۔ اور سچ پوچھئے تو میرے لیے دارالمصنفین کے ساتھ خواندہ یا ناخواندہ مہمان ہونے کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ مصنف نہ ہونے کے باوجود دارالمصنفین شروع ہی سے ہمارا گھر رہا ہے۔ مدرستہ الاصلاح کی طالب علمی کے زمانے میں بھی ہم لوگ کبھی کبھی یہاں آدھمکتے تھے۔ اس وقت بھی یاد ہے کہ سفرۂ دارالمصنفین کا روزمرہ کا معمولی کھانا بھی لذیذ ہی ہوتا تھا۔ اس وقت تو صرف کھانے ہی کے حوالہ سے دارالمصنفین ہمیں یاد رہ سکتا تھا کہ اس سے آگے کسی بات کا ہمیں شعور ہی نہ تھا۔ اس سے پہلے دو سفر دسمبر

میں نے مولانا فراہی پر کام کے سلسلے میں اچھا خاصا وقت دارالمصنفین میں گذرا۔ صباح الدین عبدالرحمن صاحب نے شاید پاکستانی ہونے کے ناطے کچھ زیادہ ہی خیال کیا۔ انواع واقسام کے کھانے کھلا کر شاد کام کیا۔ ایک آدھ رسمی دعوتیں بھی کھانے کو ملیں۔ مارچ ۱۹۸۲ء میں مولانا سعید اکبر آبادی کی آمد کے موقع پر ایک پرتکلف دعوت میں شرکت کا موقع ملا۔ ان یادگار لمحات کی کیفیت بھلائی نہیں جاسکتی۔ مگر اب جس تقریب سے آنا ہوا تھا اسکی بات ہی اور ہے۔ اس نادر موقع کی یاد برسوں تازہ رہے گی۔ یہ موقع ہی ایسا تھا۔ اس میں ایسی کئی باتیں ہیں جو مدتوں یاد رہیں گی۔ ان ہی میں ایک وہ پرتکلف کھانے بھی ہیں جو آنکھ کو نور اور دل کو سرور سے معمور کرتے رہے۔

افتتاحی اجلاس کے بعد کی بہت سی کارروائیوں میں میں شریک نہیں ہوسکا۔ خاص کر میرے لیے یہاں صرف یہی ایک مصروفیت نہ تھی۔ کانفرنس کے پروگراموں کے علاوہ مجھے کھینچنے والے ایک دو نہیں وہ بے شمار علائق تھے جو پورے ضلع میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور میں بالکل اس صورت حال سے دوچار تھا۔ جس کا نقشہ غالب نے اپنے شعر میں کھینچا ہے۔

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

افتتاحی اجلاس کے بعد ۳ بجے شبلی نیشنل کالج کا معاینہ تھا۔ چار بجے دارالمصنفین کے سبزہ زار میں شبلی اکیڈمی کی طرف سے عصرانہ تھا۔ ۵ بجے شام کتب خانہ دارالمصنفین میں نوادرات کی نمائش تھی۔ افتتاح کے بعد معمول کے اجلاس شبلی کالج کے کانووکیشن ہال میں ہوئے۔ ہال میں بڑی گنجائش تھی۔ اتنا بڑا ہال بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں بھی کم ہی نظر آئے گا۔ خاص مندوبین کے لیے کشادہ میزوں کی طویل قطار کے چاروں طرف نشستیں تھیں۔ اطراف وجوانب میں دیگر شرکاء اور سامعین کے لیے بھی خاص جگہ تھی۔ حال کے باہر طویل برآمدے میں

کرسیاں اور صوفے ڈال دیئے گئے تھے۔ اس پر بھی کھڑے ہونے والوں کی تعداد بیٹھنے والوں سے کم نہ ہوتی تھی۔ اعظم گڈھ کی تاریخ میں غالباً اپنی نوعیت کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ ویسے بھی اس دیار کے لوگ اس طرح کے مشاغل میں زیادہ ہی دلچسپی لیتے ہیں۔ دینی جلسے اور مشاعرے یہاں کی زندگی کا لازمی حصہ ہیں۔ مگر اس طرح کی کسی علمی اور دینی کانفرنس اور سیمینار کا انعقاد اس ضلع کے لیے ایک یادگار واقعہ تھا۔ دور دور سے لوگ محض سننے اور دیکھنے کے لیے کثیر تعداد میں آئے تھے۔ اور ان سب کا تعلق شہر یا قصبات سے نہیں اعظم گڈھ کے دیہات سے تھا۔ دور دراز کے گاؤں سے لوگ محض شرکت اور تسکینِ ذوق کے لیے آئے تھے۔ یہ لوگ دارالمصنفین کے مہمان نہ تھے۔ انھیں قیام و طعام کے مسائل سے دوچار ہونا پڑا ہوگا۔ سیشن کے دوران برقعہ پوش خواتین کی ٹولیاں نظر آئیں۔ اعظم گڈھ میں میرے لیے یہ نئی بات تھی۔ یہاں کے رہنے والے ایک صاحب سے میں نے ذکر کیا تو کہنے لگے۔ جب سے شبلی کالج میں بی اے، ایم اے کی کلاسیں ہونے لگی ہیں لڑکیوں کے لیے آسانی ہوگئی ہے۔ طبقۂ اناث میں کثرت سے گریجویٹ اور ماسٹر پیدا ہو رہے ہیں۔ مگر پردے کی پابندی بدستور ہے۔ پھر بھی اتنی تبدیلی یا ترقی تو ہوئی ہے کہ عورتیں مردوں کے جلسے میں آسکتی ہیں۔ مگر دوش بدوش یا شانہ بشانہ نہیں اپنے زنانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ خانہ بخانہ۔ عورتوں کی جگہ مردوں سے الگ تھی۔ مخلوط سوسائٹی کی لعنت ابھی یہاں نہیں پہنچی ہے۔ معلوم نہیں تعلیمی درسگاہوں میں کیا حال ہے۔ یہاں ہندوؤں میں بھی

کانفرنس کی کارروائی قلمبند کرنا میرے دائرۂ کار سے باہر ہے۔ یہ کام جیسا کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمن نے اختتامی اجلاس میں اعلان کیا دارالمصنفین خود انجام دے گا۔ اور ظاہر ہے وہ زیادہ شرح و بسط اور استقصاء کے ساتھ یہ کام کرسکیں گے۔ میرا مقصد کانفرنس کے بعض خاص دلچسپی کے امور کا ذکر و بیان ہے۔ کانفرنس کی اہم اور نمایاں خصوصیات میں ایک

قابلِ ذکر خصوصیت پاکستان سے اتنی بڑی تعداد میں اسکالروں کی شرکت تھی۔ سات تو ہمیں لوگ تھے۔ ہمارے علاوہ کراچی سے حکیم سعید ہمدرد اکیڈمی کے بعض ارکان کے ساتھ شریک ہوئے۔ لاہور سے اردو دائرۂ معارف اسلامیہ جامعۂ پنجاب کے نذیر حسین صاحب بھی بعد میں پہنچ گئے تھے۔ یوں گویا "تلک عشرۃ کاملۃ" نے پاکستان کی نمائندگی کی۔ ایک سیشن کی صدارت بھی پاکستان سے کرائی گئی۔ اور یہ اعزاز حکیم سعید صاحب کو ملا۔ ایک امتیاز پاکستان کو یہ بھی حاصل ہوا کہ پاکستان کے اسکالروں کے لیے ایک سیشن مخصوص کردیا گیا۔ اور ان سے وقت کی پابندی بھی اٹھالی گئی تھی۔ اس سیشن کی صدارت علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر حامد نے کی۔ مولانا امین احسن اصلاحی اور ڈاکٹر جاوید اقبال کے لیے لوگ شدت سے منتظر تھے۔ ان کی شرکت کی تشہیر ہوئی۔ مگر یہ حضرات شریک نہیں ہوئے۔ جاوید اقبال صاحب کے متعلق نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن مولانا اصلاحی سے ذکر آیا تو انھوں نے بتایا کہ انھیں تو دعوت ہی نہیں ملی۔ یہ الگ سوال ہے کہ دعوت ملتی تو وہ شریک ہوتے یا نہ ہوتے۔ اس کانفرنس کے طفیل ڈاکٹر سلمان ندوی خلف الصدق علامہ سید سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی۔ وہ ڈربن یونیورسٹی سے آئے تھے۔ کم و بیش تیس برس کے بعد ملنا ہوا۔ سندھ یونیورسٹی میں ہمارا ساتھ تھا۔ کسی پرانے ساتھی کا اتنے طویل عرصے کے بعد ملنا کیا معنی رکھتا ہے۔ اہل نظر سمجھ سکتے ہیں۔ اور ایک شاعر کے نقطۂ نظر سے تو یہ مسیحا و خضر کی ملاقات سے بھی بہتر ہے۔

اے ذوق کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا
بہتر ہے ملاقاتِ مسیحا و خضر سے

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور اداروں سے جو اصحاب شریک ہوئے ان کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان میں خورد و بزرگ اور برابر کی حیثیت کے نجانے کتنے ہی نام ہیں۔ ان کے ذکر سے اس لیے صرفِ نظر کرتا ہوں کہ اگر کوئی نام رہ گیا جس کا قوی احتمال ہے تو بجا طور پر

شکایت ہوگی۔

سمینار کے آخری اجلاس میں چھپے ہوئے پروگرام کے مطابق دو اجلاس ہونے تھے۔ ۹ تا ۱
بجے دوپہر۔ ۳ تا ۴ بجے شام۔ پہلے اجلاس میں حسب معمول مقالات پڑھے گئے اور بحثیں ہوئیں،
اختتامی اجلاس جو وقفے کے بغیر جاری رہا، تجاویز قرار دادوں، کانفرنس کے نتائج کے جائزہ،
شکریہ اور الوداعی کلمات کے لئے وقف رہا۔

اختتام سے پہلے ایک اہم فیصلہ کانفرنس نے یہ کیا کہ یہ سلسلہ جس کی ابتدا دار المصنفین
نے کی ہے آئندہ بھی جاری رکھا جائے۔ حکیم محمد سعید نے اگلی کانفرنس پاکستان میں منعقد کرنے کی
پیش کش کی۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے قطر کا نام تجویز کیا۔ یہ بھی تجویز کیا گیا کہ کانفرنس کو مستقل
حیثیت دینے کے لیے اس کا صدر دفتر دار المصنفین میں قائم کر دیا جائے۔ سب سے آخر میں سید
صباح الدین عبد الرحمٰن ناظم دار المصنفین شبلی اکیڈمی نے جذبات سے مملو اور پُر اثر تقریر کی۔ وفورِ
جذبات میں ان کی آنکھوں سے پیمانے چھلک چھلک گئے۔ تقریباً ۲ بجے مولانا علی میاں کے دعائیہ
کلمات کے ساتھ اسلام اور مستشرقین پر یہ تاریخی سمینار ختم ہوا۔

سمینار کے متعلق عام تاثر یہی تھا کہ بہت کامیاب رہا۔ توقع سے کہیں زیادہ کامیاب،
خود دار المصنفین کے لیے بھی اس کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ دار المصنفین
پہلے بھی اس قسم کے تجربے سے گذر چکا ہے۔ لیکن ندوہ کے تعاون اور اشتراک عمل نے اسے
چار چاند لگا دیئے۔ جو بات ہوئی خوب سے خوب تر ہوئی۔ علی میاں کے ذاتی تعلقات اور وسیع
تجربات نے سمینار کو کامیاب بنانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔ وہ خود مسلسل شریک و موجود
رہے۔ ندوہ کے اساتذہ اور طلبہ کی ایک پوری ٹیم شروع سے آخر تک مصروف کار رہی۔
جو سوجھ بوجھ، علمی لیاقت اور انتظامی صلاحیت کے اعتبار سے ہی فائق نہ تھے بلکہ امانت، دیانت

زرف شناسی اور احساس ذمہ داری کے لحاظ سے بھی نمایاں حیثیت کے مالک تھے۔ آج کے زمانے
میں جہاں پہلی جنس عام ہے دوسری جنس کی کمیابی کا کوئی حل نہیں۔ جہاں تک کہ کانفرنس کے ظاہری
انتظامات کا تعلق ہے اول درجے کا اور اعلیٰ ہی نہیں اسے مافوق کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا۔ علمی لحاظ
سے بھی کانفرنس کا معیار بحیثیت مجموعی بلند تھا۔ مقالات محنت سے اور تیاری کے بعد لکھے گئے تھے،
عربی، اردو، انگریزی تینوں زبانوں میں مقالے پڑھے گئے۔ جن مندوبین نے مقالے پڑھے یا تقریریں
کیں ان کی تفصیل باعث تطویل ہوگی۔

ان میں ایک کثیر تعداد ان فضلاء کی تھی جو مبصر کی حیثیت سے کانفرنس میں شریک ہوئے انھوں نے مقالہ پڑھا نہ
تقریر کی مگر انکی شرکت سے کانفرنس کی رونق دوبالا ہوئی اور افادیت میں اضافہ ہوا۔ انکے وجود میں کانفرنس کو سخن شناس سامعین
ملے جو اکثر کانفرنسوں کو میسر نہیں ہوتا۔ انہیں جہاں ایک معتدبہ تعداد جدید یونیورسٹیوں اور اداروں کے فضلاء
کی تھی۔ وہاں خاصی بڑی تعداد قدیم طرز کے ان عربی مدارس کے تعلیم یافتہ علماء کی تھی جو اعظم گڈھ
اور دوسرے اضلاع میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دیوبندی، ندوی، اصلاحی، فلاحی سبھی تھے۔ ان کی ظاہری
وضع ایک سادہ مسلمان کی تھی۔ وہ آئے بھی تھے مضافاتی بستیوں سے مگر ان کا علمی ذوق کسی
طور سے مقالہ پڑھنے والوں سے کمتر نہ تھا۔ یہ غیر معروف گمنام اسکالر اعظم گڈھ کے گاؤں گاؤں
بلکہ بقول ہمارے ایک ساتھی احمد خاں کے یہاں کے چپے چپے پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے
بہتوں کو میں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر دکھ ہوتا تھا کہ نیرنگی سیاست دوراں نے انھیں
وہ مقام نہ دیا جس کے وہ مستحق تھے۔ میں سمجھتا ہوں کہ علم و فضل کے دربار میں سب سے زیادہ داد
و تحسین کے حقدار وہ ہیں۔ میں ان کو غائبانہ سلام کرتا ہوں۔

ع سلام ما برسانید ہر کجا ہستند

اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر یہ تاریخ کا پہلا سمینار تھا۔ استشراق ایک اسلام

دشمن تحریک ہے جو مدت سے سرگرم عمل ہے مگر اس کے جواب میں دفاعی تحریک بوجوہ شروع نہ ہوسکی۔ اس کانفرنس میں شرکاء کے خیالات و جذبات کو دیکھنے کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ اب اس دفاعی تحریک کی داغ بیل پڑچکی ہے اگر خدا کی تائید و نصرت شامل حال رہی تو یہ تحریک استشراق کا موثر جواب ثابت ہوگی۔ اسلام اور مستشرقین کے اس سمینار میں کوئی مستشرق شریک نہیں ہوا۔ جہاں یہ امر بہتوں کے لیے موجب حیرت ہوگا، میرے نزدیک یہی اس تحریک کے گہرا ہونے کی ضمانت ہے۔ مسلمانوں کی بہت سی تحریکیں اپنے انجام اتمام تک پہنچنے سے اس لیے قاصر رہ جاتی ہیں کہ یا تو ان کے شروع کرنے والے ہی غلط لوگ ہوتے ہیں یا بعد میں وہ غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہیں جن کا مقصد ہی اس تحریک کو کامیاب نہیں ناکام بنانا ہوتا ہے۔ سمینار میں مسائل پر بحث و نظر کا سلسلہ بھی ساتھ چلتا رہا۔ مخالف و موافق ہر طرح کے خیالات آزادی کے ساتھ پیش کئے جاتے رہے کہ علمی مجالس کا دستور یہی ہے۔ مگر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی کو بھی سمینار کے اصل اغراض و مقاصد سے اختلاف تھا۔ اس موضوع پہ یہ پہلا سمینار تھا۔ آیندہ جو سمینار ہوں گے وہ یقیناً اس سے بہتر ہوں گے۔ نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول۔

اس جگہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ مستشرقین اور اسلام کے موضوع پہ آواز راولپنڈی میں شام ہمدرد کے ایک اجتماع میں مولانا ہاشمی نے اٹھائی تھی۔ پھر یہ تقریر ادارۂ تحقیقات اسلامی کے اردو رسالہ فکر و نظر میں شائع ہوئی۔ رسالہ معارف دارالمصنفین اعظم گڈھ نے بھی شائع کیا۔ دوسری زبانوں میں اس کے ترجمے ہوئے۔ اور تقریباً چالیس رسائل نے اسے شائع کیا۔ بالکل اسی عنوان اور اسی موضوع پہ دارالمصنفین میں یہ بین الاقوامی سمینار منعقد ہوا تھا۔

اختتامی اجلاس سے فارغ ہو کر دارالمصنفین کی کانفرنس کا ولیمہ کھایا گیا۔ ولیمہ کسی کی شادی کا ہوتا ہے۔ آغاز کلام ہی میں جہاں میں نے کانفرنس کے انتظامات کا ذکر کیا ہے اپنے اس تاثر کو ظاہر کر دیا ہے۔ کہ سب ٹھاٹ شادی کا نظر آیا۔ دوپہر کے کھانے سے میرے اس تاثر کو تقویت ہوئی۔ کھانا اس طرح پر تکلف تھا جس طرح شادی کا آخری کھانا پر تکلف ہوتا ہے۔ اس کانفرنس کی ایک ایک ادا سے بھی ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی چاہنے والا باپ اپنے لڑکے یا لڑکی کی شادی میں اپنے دل کے تمام ارمان پورے کرنے پر کمربستہ ہو۔ تین دن پلک جھپکتے گذر گئے۔ ہر روز روز عید، ہر شب شب برات ہو تو وقت کا احساس ختم ہوجاتا ہے۔

۲- جناب شیخ نذیر حسین مدیر اردو انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ لاہور

ہندوستان کے بعض علمی و دینی اداروں خصوصاً دارالمصنفین اعظم گڈھ اور دارالعلوم ندوۃ العلماء کو دیکھنے کی ایک مدت سے آرزو تھی، الحمد للہ کہ دارالمصنفین کے ایک سمینار نے یہ آرزو پوری کر دی، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے جنوری ۸۲ء کے اوائل میں مجھے دعوت دی کہ میں دارالمصنفین اعظم گڈھ کے زیر انتظام ایک سمینار میں شرکت کروں جو کہ "اسلام اور مستشرقین" کے موضوع پر ۲۱/۲۲/۲۳ فروری ۸۲ء کو منعقد ہو رہا ہے۔ پاسپورٹ اور ویزا کے حصول اور دوسرے موانع و مشکلات سے عہدہ برآ ہونے کے بعد راقم السطور ۲۲ فروری کو اعظم گڈھ پہنچ گیا۔ اعظم گڈھ بنارس سے ستر، اسی میل دور مشرقی یوپی کے آخری کونے پر واقع ہے۔ اعظم گڈھ کے نواحی قصبات ہمیشہ سے علوم دینیہ کے مرکز رہے ہیں۔ اور ان کی خاک سے علماء اور صلحاء اٹھے ہیں، میری آمد سے دو روز قبل پاکستان سے جناب حکیم محمد سعید (ہمدرد دواخانہ) طبی مشیر صدر پاکستان، ڈاکٹر عبدالواحد ہالے پوتا ڈائریکٹر ادارۂ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد اور ان کے چار رفقاء اور مفتی سیاح الدین کاکاخیل (فیصل آباد) اعظم گڈھ پہونچ چکے تھے، مہمانوں کے لیے

علحدہ علحدہ خیموں کا بہت اچھا انتظام تھا۔

شب بسری کے بعد نماز فجر سے فارغ ہوتے ہی مجھے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ) کی قیام گاہ کی تلاش ہوئی، پتہ چلا کہ موصوف دارالمصنفین کے مہمان خانہ میں مقیم ہیں۔ ملاقات پر مولانا موصوف نے حسب معمول محبت و گرم جوشی کا اظہار فرمایا۔ حاضرین مجلس سے میرا تعارف کرایا اور فرمایا کہ اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی ترتیب و تدوین جیسا اہم بالشان علمی کام نہ تو مصر میں ہو رہا ہے۔ اور نہ شام میں۔ انسائیکلو پیڈیا کی پیش رفت کے بارے میں بھی سوالات کرتے رہے آخر میں مجھے لکھنؤ آنے اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں ایک دو روز قیام کرنے کی نہایت محبت سے دعوت دی، اس کے بعد میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدیر برہان (دہلی) کی خدمت میں حاضر ہوا، مولانا نے میرا تعارف مہمانانِ کرام مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (ندوۃ المصنفین دہلی) قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی اور قاضی سجاد حسین (صدر مدرس مدرسہ عربیہ فتح پوری دہلی و مترجم مثنوی مولانا روم) سے کرایا، قاضی زین العابدین آج سے ۴۵، ۴۶ برس قبل مولانا تاجور کے ساتھ رسالہ ادبی دنیا میں بطور مدیر معاون کام کرتے رہے ہیں، قاضی زین العابدین کے بیٹے زین الساجدین مسلم یونیورسٹی میں دینیات کے لکچرر ہیں۔ اور نہایت سعادت مند اور خدمت گزار نوجوان ہیں۔ مجھے پروفیسر خلیق احمد نظامی (علی گڑھ) مصنف مشائخ چشت سے بھی ملنے کا شوق تھا، جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مجھے ان کے پاس لے گئے، خلیق صاحب نہایت محبت و تپاک سے ملے اور فرمایا کہ انھوں نے مشائخِ چشت کا تذکرہ سات جلدوں میں لکھا ہے ان میں سے ایک جلد شائع ہو چکی ہے۔ دوسری زیر طبع ہے۔ اور باقی بھی وقفہ وقفہ سے شائع ہوتی رہیں گی۔ جناب خواجہ احمد فاروقی صاحب صدر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی نے اپنا تعارف خود کرایا، فاروقی صاحب اردو کے مشہور ادیب

و نقاد ہیں۔ مگر میرے نزدیک وہ نہایت غیرت مند اور دردمند مسلمان بھی ہیں۔ مولانا عمران خان ندوی (بھوپال) سے بھی پر لطف ملاقات ہوئی۔ مولانا ابواللیث اصلاحی (امیر جماعت اسلامی ہند) کے بھی نیاز حاصل ہوئے۔

سیمینار: سیمینار کا افتتاح ۲۱/ فروری کو ہوا۔ افتتاحی تقریروں کے بعد مولانا شبلی اور اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف کے مسودوں اور قلمی کتابوں کی نمائش ہوئی۔ جو قابل دید تھی۔ دوسرے دن پاکستانی فضلاء نے مقالے پیش کیے۔ افسوس کہ راقم الحروف دیر سے پہونچنے کی وجہ سے ان اجلاسوں میں شرکت سے محروم رہا، تیسرے دن سمینار نو بجے صبح ہوا، اس نشست کے صدر ڈاکٹر سید سلمان ندوی تھے۔ جو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور کے فرزند ارجمند اور ڈربن یونی ورسٹی (افریقہ) میں شعبۂ اسلامیات کے صدر ہیں، مقالات چوں کہ زیادہ تھے۔ لہٰذا ہر مقالہ نگار کو پانچ پانچ منٹ تقریر کے لیے دیے گئے۔

ان مقالات میں ڈاکٹر اوصاف علی (ہمدرد فاونڈیشن دہلی) کا مقالہ معاصر مستشرقین پر تھا اور خاصا معلومات افزا تھا۔ دوسرا اہم مقالہ خواجہ احمد فاروقی کا تھا جس میں ان ہندی علماء کا ذکر خیر تھا، جنھوں نے عیسائی مشنریوں کے مقابلہ میں اسلام کا دفاع کیا، اس کے بعد مشہور مصری فاضل اور مفکر جناب یوسف القرضاوی نے فصیح و بلیغ عربی میں تقریر کی۔ ان کی تقریر میں آبشار کا زور تھا، تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ صحیح اسلام وہی ہے جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ اور جس پر صحابۂ کرام نے عمل کر کے دکھایا۔ افسوس کہ راقم الحروف کا مقالہ بعنوان "مستشرقین اور علوم اسلامیہ" سمینار کے اختتام کے بعد دوسرے دن پہونچا، اب یہ مقالہ مجموعۂ مقالات میں شامل ہوگا آخر میں مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دارالمصنفین نے سب مہمانوں خصوصاً راقم السطور اور جناب عبدالرحمٰن صاحب کونڈو کا گلوگیر آواز میں شکریہ ادا کیا،

جو بے شمار موانع اور مشکلات کے باوجود لاہور اور سری نگر سے آکر شریک ہوئے تھے۔

اس سمینار کے ذکر میں مولوی سید سلمان حسنی ندوی کا بھی ذکر ضروری ہے۔ جو اردو اور انگریزی تقریروں کا عربی میں اور عربی تقریروں کا اردو میں خلاصہ بیان کر رہے تھے، یہ سمینار ہر طرح سے کامیاب رہا، سمینار کو کامیاب بنانے اور مہمانوں کو راحت و احترام پہنچانے کے لیے جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب، ان کے رفقاء اور شبلی نیشنل کالج کے طلبہ نے بڑی محنت کی جس کے تمام لوگ معترف تھے۔ شام کو بیشتر مہمان رخصت ہوگئے۔ اور راقم السطور مولانا سعید احمد اکبرآبادی اور جناب عبدالرحمٰن کوندو صاحب خیموں سے اٹھ کر دارالمصنفین کے مہمان خانہ میں آگئے جہاں ہر طرح کی سہولت اور آرام میسر تھا۔ عبدالرحمٰن کوندو صاحب سری نگر کی ذی علم شخصیت ہیں، انھوں نے مولانا انور شاہ مرحوم کے حالات میں حیات انور لکھی ہے۔ جس کے چار ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

دارالمصنفین دارالمصنفین یا شبلی اکاڈیمی مولانا شبلی مرحوم و مغفور کے علمی خوابوں کی تعبیر ہے۔ اسکی تعمیر و ترقی میں مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی خدمات اور مولانا مسعود علی ندوی مرحوم کی انتظامی صلاحیتوں کو بڑا دخل ہے۔ سیرۃ النبیؐ کی تالیف و اشاعت کے سلسلہ میں یہ ادارہ ملک گیر شہرت حاصل کر چکا ہے۔ اور سیرت کے علاوہ گزشتہ چھیاسٹھ ۶۶ برسوں میں مختلف علمی و دینی موضوعات پر تقریباً دو سو دس ۲۱۰ کتابیں شائع کر چکا ہے۔ دارالمصنفین شہر اعظم گڈھ سے ایک میل باہر ایک پُرفضا باغ میں واقع ہے، جس کا رقبہ پنجاب یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کے برابر ہے۔ دفتر، کتب خانے، پریس اور مہمان خانے کی عمارتیں پختہ اور شاندار ہیں رفقاء کے لیے بھی آرام دہ مکانات ہیں۔ ان سب عمارتوں میں دارالمصنفین کی چھوٹی مگر خوب صورت اور نازک سی مسجد جاذبِ توجہ ہے۔ جو نواب مزمل اللہ خاں (علی گڑھ) کی فیاضی اور مولانا مسعود علی ندوی

کے عمارتی ذوق کی مظہر ہے۔ مسجد کے صدر دروازہ سے کچھ فاصلہ پر مولانا شبلیؒ اور ان کے بیٹے حامد نعمانی کی قبریں ہیں جو کچی ہیں۔ ایک کونے میں مولانا عبدالسلام ندویؒ اور مولانا مسعود علی ندویؒ سابق منیجر دارالمصنفین محو خوابِ ابدی ہیں۔ اب دارالمصنفین کے ناظم یا روحِ رواں مولانا سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ہیں جو اردو کے صاحبِ طرز انشاپرداز، فارسی زبان کے ادیب و محقق اور تاریخ اسلام کے صاحبِ بصیرت عالم ہیں، موصوف سراپا شفقت و محبت اور پیکر مروت و شرافت ہیں۔ دوسری علمی شخصیت مولوی ضیاء الدین صاحب اصلاحی ہیں۔ موصوف تواضع و انکسار کا نمونہ ہیں، اصلاحی صاحب کی تذکرۃ المحدثین کی دو ۲ جلدیں شائع ہو چکی ہیں تیسری جلد طباعت کے مرحلہ میں ہے۔

دوسرے دن ناشتہ کے بعد ہم محدث جلیل مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی سے ملنے مئو گئے۔ شام کے چھ ۶ بجے ہم واپس دارالمصنفین پہونچ گئے۔ رات مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ہمارے کمرہ میں تشریف لائے اور دیر تک دارالمصنفین کے آئندہ اشاعتی پروگرام کے بارہ میں گفتگو کرتے رہے، میں نے عرض کیا کہ اب اسلام کی اقتصادیات، اسلام کی معاشیات اور اسلام کے نظامِ حکومت پر کتابوں کی ترتیب و تدوین کی زیادہ ضرورت ہے، اسکے علاوہ عالم اسلام کی اہم ترین ضرورت فقہ اسلامی کی تدوین جدید ہے، مولانا نے میری گزارشات کو بڑے غور سے سنا۔

دارالمصنفین کی ادبی خدمات

دارالمصنفین کی ادبی خدمات پر پی۔ ایچ۔ ڈی کا ایک پُر مغز مقالہ جس کو کتابی شکل میں لانے کے بعد، فاضل مصنف نے اپنے مربی مولانا شاہ معین الدین ندوی کے نام معنون کیا ہے، از ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی۔ قیمت۔ ۲۰ روپیے

مطبوعاتِ جدیدہ

رسالوں کے خاص نمبر

جامعہ مولانا محمد اسلم جیراجپوری نمبر
مرتبہ جناب ضیاء الحسن فاروقی و عبد اللطیف اعظمی صاحبان،
سائز ۲۰×۲۶ کاغذ کتابت و طباعت عمدہ، صفحات ۱۸۴،
قیمت چھ روپیے، پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی۔

مولانا حافظ محمد اسلم جیراجپوری مرحوم جامعہ کی ابتدا و تاسیس ہی سے اس کے علمی و تعلیمی کاموں میں شریک تھے۔ انھوں نے "مجلس ملی" کے دوسرے ارکان کی طرح تنگی و ترشی کے ساتھ ہر حال میں اس کی خدمت کرتے رہنے کا عہد کیا تھا۔ وہ عرصہ تک جامعہ ملیہ کے آرگن ماہنامہ "جامعہ" کے اڈیٹر بھی رہے۔ علاوہ ازیں وہ اردو کے مشہور مصنف تھے، اسلامی علوم اور فارسی زبان و ادب پر انکی نظر وسیع تھی، ان کی وفات کو مدت ہوئی مگر ابھی تک ان پر کوئی کام نہ ہوا تھا۔ اس لیے جامعہ کے موجودہ مرتبین نے انکی یادگار میں یہ خاص نمبر شائع کیا ہے۔ اس کی ابتدا خود مولانا ہی کے ایک مضمون "میری طالب علمی" سے کی گئی ہے۔ اس کی حیثیت خود نوشت حالات کی ہے، اس میں انھوں نے اپنی ابتدائی نیز تعلیمی و تصنیفی زندگی، خاندانی حالات، ملازمت، اساتذہ، رفقا اور اپنے والد ماجد مولانا سلامت اللہ جیراجپوری کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے ریاست بھوپال سے تعلق اور نواب صدیق حسن خان اور ان کے بعد کے دور کے وہاں کے دینی و علمی ماحول اور متعدد حنفی و اہلحدیث علماء کا ذکر بھی آگیا ہے۔ جس سے بہت مفید اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتے ہیں۔ ان کے صاحبزادہ ڈاکٹر محمد معظم کا مضمون بھی قابل ذکر ہے وہ ایک اچھے اور کامیاب ڈاکٹر ہیں۔

یہ مضمون لکھکر انھوں نے اپنے کو اہل قلم کے زمرہ میں شامل کر لیا ہے۔ اس سے مولانا کی زندگی کے بعض ایسے پہلو سامنے آگئے ہیں جن کو وہی لکھ سکتے تھے۔ چودھری غلام احمد پرویز مولانا کے خاص تربیت یافتہ اور ان کی زندگی کے نشیب و فراز سے واقف تھے۔ ان کے مضمون "مرد درویش" میں مولانا کی سادگی و قناعت کے علاوہ ان کے علمی تبحر، ذہانت، نکتہ سنجی اور قرآن مجید سے شغف وغیرہ کا حال بھی تحریر کیا ہے۔ جناب سعید انصاری کو بھی ان سے براہ راست واقفیت رہی۔ انھوں نے جامعہ سے انکی وابستگی، قدیم و جدید تعلیم کے بارہ میں ان کے خیالات اور مجتہدانہ بصیرت کا ذکر کیا ہے۔ اس ضمن میں یتیم پوتے کے حق وراثت کے سلسلہ میں ان کے نقطۂ نظر کی تحسین کی ہے۔ حالانکہ ان کی یہ رائے جمہور امت کے خلاف ہے۔ جناب عبد اللطیف اعظمی کا مضمون "مولانا اسلم کی اقبال شناسی" دلچسپی سے پڑھا جائیگا، اسمیں اقبال سے انکے تعلقات کا ذکر ہے، اس ضمن میں دونوں کی باہمی خط و کتابت اور اقبال کی کتابوں پر انکے تبصروں کا تذکرہ کیا ہے، اس سے انکی ادبی خوش مذاقی، اور تصوف کے بارہ میں انکی مبصرانہ نظر اور متوازن رائے بھی معلوم ہوتی ہے اور اقبال کی نگاہ میں انکی اہمیت کا پتہ بھی چلتا ہے۔ انھوں نے ایک مضمون میں مولانا کی کتابوں کی توضیحی ببلیوگرافی اور دوسرے میں انکی زندگی کی اہم تاریخیں دی ہیں پروفیسر شیر الحق نے مولانا کی مشہور کتاب "تاریخ القرآن" کا جائزہ لیکر خصوصیت سے وحی۔ قرآن میں نسخ اور اسکی جمع و ترتیب کے متعلق ان کے خیالات واضح کیے ہیں۔ ڈاکٹر اطہر پرویز نے بچوں کے ساتھ ان کے شفقت آمیز برتاؤ کا آنکھوں دیکھا حال تحریر کیا ہے اور ڈاکٹر شعیب اعظمی نے انکی فارسی زبان و ادب میں مہارت دکھائی ہے۔ ان سے قربت رکھنے والوں میں پروفیسر محمد مجیب، مولانا عبد السلام قدوائی، رئیس احمد جعفری اور معین الدین حارث کی تحریریں بھی اس نمبر کی زینت ہیں جن سے انکی سیرت و شخصیت کے خط و خال نمایاں ہوتے ہیں، شروع میں جامعہ کے لائق مرتب جناب ضیاء الحسن فاروقی نے انکی شخصیت پر بڑی خوش مذاقی سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے اور آخر میں بجا طور پر یہ لکھا ہے کہ "مولانا اسلم نے علم و تدبر کو اپنا پیشوا بنایا تھا اور اس بات کو وہ پسند کرتے تھے کہ انکی

تقلید بھی بے سوچے سمجھے نہ کی جائے، انکی علمی زندگی کا یہی طرۂ امتیاز تھا، اور یہی پیغام وہ ہمیں دے گئے ہیں"۔ یہ نمبر مولانا کی سیرت و شخصیت اور انکی علمی، ادبی اور دینی خدمات کو سمجھنے کیلئے بہت مفید ہوگا، اس سے ان پر کام کرنے والوں کو بڑی مدد ملے گی، مگر اس نمبر میں مولانا کی قرآنی خدمات پر سیر حاصل بحث رہ گئی ہے، نیز انکے بعض تفردات خصوصاً احادیث اور بعض تفسیری مسائل سے اہل علم کے بڑے طبقہ کو جو اختلاف تھا اس پر بھی مبسوط گفتگو کی ضرورت تھی۔

نیا دور منشی نولکشور نمبر ۱۔ مرتبہ جناب امیر احمد صدیقی و شاہ نواز قریشی صاحبان، سائز لمبا، کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۳۶ قیمت ایک روپیہ، پتہ محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش۔

اردو کے محسنین میں آنجہانی منشی نولکشور کا نام سرفہرست ہے، ان کے مطبع کی ملک کے کئی بڑے شہروں میں شاخیں تھیں اور اسکی بدولت اردو و ہندی ہی نہیں فارسی و عربی کی بھی بیشمار نادر و نایاب کتابیں شائع ہوئیں جسکی وجہ سے اسلامی علوم و فنون کا بیش قیمت ذخیرہ دستبرد حوادث سے محفوظ رہا، اترپردیش کی حکومت کا رسالہ ماہنامہ نیا دور کو معیاری، بلند پایہ اور ضخیم نمبروں کی اشاعت کیلئے نیک نامی اور بڑی شہرت حاصل ہے، ۱۹۸۰ء میں اس نے اردو کے اس محسن اور اسلامی علوم کے خدمت گزار کی قدر دانی کی غرض سے یہ خاص نمبر شائع کیا ہے، جو منشی جی کی سیرت و شخصیت و کمالات اور ان کے مطبع کی شاندار خدمات پر مضامین و منظومات پر مشتمل ہے، مضمون نگاروں میں ڈاکٹر نورالحسن، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر انوار الحسن، ڈاکٹر امیر حسن عابدی، ڈاکٹر عبدالاحد خلیل، امیر حسن نورانی، جناب امین سلونوی، مرزا جعفر حسین، ڈاکٹر تنویر احمد علوی، کنور مہندر سنگھ بیدی، حکیم عبدالقوی دریابادی، ضیاء الدین اصلاحی، ڈاکٹر حنیف نقوی، ڈاکٹر نیر مسعود، مولوی شمس تبریز خاں، ڈاکٹر رنجیت کمار بھارگو وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، مضامین میں منشی جی کے حالات و سوانح طباعت و اشاعت میں انکے غیر معمولی اہتمام اور مطبع کی عظیم الشان خدمات نیز منشی جی کے جاری کردہ اودھ اخبار وغیرہ کے بارہ میں بھی بڑے معلومات لکھی گئی ہیں، بعض مضامین میں منشی جی کے ہم عصر معاصرین سے ان کے تعلقات کا ذکر بھی ہے، منظومات کا حصہ بھی معیاری ہے، علم و فن کے اس خادم پر یہ نمبر ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔

"ع، پ"

جلد ۱۳۰ ماہ صفر المظفر ۱۴۰۳ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۸۲ء عدد ۶

مضامین

مقالات